بسم اللہ الرحمن الرحیم



قرآن کریم اور رمضان کریم

حضرت مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

عنوان..................قرآن کریم اور رمضان کریم

تالیف...............مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

عنوانات و ترتیب.......ناصر الدین خان عامر

ناشر..................الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ

اشاعت...............مارچ ۲۰۲۴ء

فہرست

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کا نزول ہوا ہے اور اسی میں وہ سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں تراویح، تہجد اور نوافل کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی اپنے طور پر تلاوت بھی اس ماہِ مبارک میں کثرت سے ہوتی ہے جو قرآن کریم اور رمضان المبارک کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و محبت اور قلبی لگاؤ کا زندہ اظہار ہے۔ قرآن کریم نسلِ انسانی کی قیامت تک راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کا جامع اور آخری پیغام ہے، اس لیے یہ سلسلہ قیامت تک اسی طرح ان شاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گا، البتہ تلاوت و قراءت کے علاوہ قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کے اور بھی بہت سے تقاضے ہیں جن میں سب سے بڑا دائرہ شخصی، خاندانی اور معاشرتی معاملات میں راہنمائی حاصل کرنے کا ہے جس کی طرف ہماری توجہ کم ہوتی ہے جبکہ اسے اس کا صحیح مقام اور درجہ دینا ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ راقم الحروف کو مختلف اجتماعات میں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ عرض کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے اور ان میں سے اکثر گزارشات قلمبند بھی ہو جاتی ہیں، عزیزم ناصر الدین خان عامر نے ان کا ایک انتخاب زیر نظر مجموعہ میں مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کاوش بہت سے لوگوں کی راہنمائی کا باعث بنے گی۔ اللہ تعالیٰ اسے ہم سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں اور قبولیت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

۱۵ مارچ ۲۰۲۴ء

مسیحی دنیا کو قرآن کریم کی دعوت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۱ دسمبر ۱۹۹۸ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں قرآن کریم نازل ہوا اور اسی مہینے میں دنیا بھر میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ اتفاق سے کرسمس ڈے بھی اس سال رمضان المبارک میں آیا ہے اور آئندہ مزید دو سال تک اسی ماہ مبارک میں کرسمس ڈے آئے گا۔ یہ کرسمس ڈے مسیحی برادری کی سالانہ عید ہے جو مسیحی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ ولادت کے عنوان سے منائی جاتی ہے اور دنیا بھر میں اس موقع پر رنگا رنگ تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

دیگر مذاہب کے تہواروں میں ہم آہنگی کا اظہار

انبیاء سابقینؑ کے حوالے سے ہماری دینی روایت یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں آباد یہودیوں کو دیکھا کہ وہ عاشور یعنی دس محرم کو روزہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بتایا کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی اور فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرق ہو گیا تھا، اس کی خوشی میں ہم یہ روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا نحن احق بموسیٰ منکم کہ حضرت موسیٰؑ پر ہمارا حق تم سے زیادہ ہے اس لیے ہم بھی اس دن روزہ رکھیں گے۔ چنانچہ آخر عمر تک جناب نبی اکرمؐ کا معمول رہا کہ آپؐ دس محرم کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ البتہ آخری سال یہ فرمایا کہ ہمارے روزے اور یہود کے روزے میں کچھ فرق ہونا چاہیے، اس لیے آئندہ سال اگر موقع ملا تو ہم دس محرم کے ساتھ ایک اور دن کا روزہ بھی ملائیں گے۔ مگر اگلے سال کے محرم سے قبل جناب نبی اکرمؐ کا وصال ہو گیا، اس بنا پر فقہاء کرام مسئلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دس محرم کو نفلی روزہ رکھنا سنتِ نبویؐ ہے لیکن تنہا اس دن کا روزہ نہ رکھا جائے بلکہ بہتر ہے کہ اس کے ساتھ نو محرم یا گیارہ محرم کا روزہ بھی ملا لیا جائے تاکہ اس حوالے سے جناب نبی اکرمؐ کی آخری خواہش کی تعمیل بھی ہو جائے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اممِ سابقہ کے مذہبی تہواروں میں ان کے ساتھ کسی درجہ کی ہم

آہنگی کا اظہار کوئی حرج کی بات نہیں ہے، بشرطیکہ اس سے اسلام کی کوئی روایت متاثر نہ ہوتی ہو اور ملتِ اسلامیہ کا امتیاز قائم رہے۔

سابقہ آسمانی تعلیمات کی حفاظت اور تصدیق

قرآن کریم انبیاء سابقین علیہم السلام کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے اور تورات، زبور اور انجیل سمیت سب سابقہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو وحی الٰہی تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم خود کو ان تمام کتابوں اور صحیفوں کی مشترک تعلیمات کا محافظ اور تصدیق کنندہ قرار دیتا ہے، اور ان سب امتوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات و تصورات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی پیروی کریں۔ کیونکہ انسان جب بھی اپنی سوچ اور خواہش کے پیچھے چلے گا تو گمراہی کا شکار ہوگا، اور جب وہ اپنی خواہشات اور فکر و خیال کو آسمانی تعلیمات کے تابع کر دے گا تو اسے اعتماد اور سکون میسر آئے گا۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہی ہے بلکہ اس کا کہنا ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں کی دعوت بھی یہی تھی جسے ان کتابوں کی پیروی کا دعویٰ کرنے والوں نے بھلا دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے پہلی کتابوں کے علمبرداروں بالخصوص یہودیوں اور عیسائیوں کو اس بات پر بار بار جھنجھوڑا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر عمل کیوں نہیں کرتے اور انہوں نے آسمانی تعلیمات کو کیوں پس پشت ڈال رکھا ہے؟

یہود و نصاریٰ کی باہم دوستی کی پیشگوئی

یہود و نصاریٰ باہم متحارب قومیں تھیں اور ان کی آپس کی محاذ آرائی اور کشت و خون سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اس دور میں ان کی آپس کی دوستی کی پیشگوئی کی جب ان دونوں قوموں کے درمیان دوستی کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی سے منع کرتے ہوئے کہا کہ بعضھم اولیاء بعض کہ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تاریخ نے قرآن کریم کی اس پیشگوئی کو اس طرح سچا کر دکھایا کہ آج یہودی اور عیسائی اپنی تمام تر دشمنی اور لڑائیاں بھلا کر باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ عیسائی دنیا کے وسائل اور یہودی دماغ مل کر اسلام اور عالمِ اسلام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

مشترک اقدار کی طرف واپسی کی قرآنی دعوت

مگر ان سب باتوں سے قطع نظر جی چاہتا ہے کہ مسیحی برادری کو ان کی اس عید پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے قرآن کریم کی وہ دعوت دہرادی جائے جس میں مسیحی دنیا بلکہ سب اہلِ کتاب کو آسمانی تعلیمات کی ”مشترک اقدار“ کی طرف واپس لوٹ آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ میں ان الفاظ کے ساتھ دی گئی ہے کہ:

> ”اے پیغمبرؐ! اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ آجاؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔ پس اگر یہ اہلِ کتاب اس بات کو قبول نہ کریں تو اے مسلمانو! تم کہہ دو کہ تم سب گواہ رہو کہ ہم تو بے شک اس حکم کو ماننے والے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کو مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان ”قدر مشترک“ قرار دیا ہے:

1. ایک توحیدِ الٰہی کا اقرار اور شرک سے بیزاری،
2. اور دوسری انسان پر انسان کی حکمرانی کی نفی۔

یہ دو اصول ہیں جو قرآن کریم کے بقول تمام آسمانی مذاہب میں قدرِ مشترک ہیں اور ان پر کسی حالت میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اہلِ کتاب کے نہ ماننے کی صورت میں بھی مسلمانوں کو اس پر قائم رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یعنی قرآن کریم عبادت اور حاکمیت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بنیاد قرار دیتا ہے، اور انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی کو رد کرتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ حاکمیت کے اختیارات انسان شخصی حکمرانی کی صورت میں اپنے پاس رکھنا چاہے، کسی طبقہ کی حکمرانی کا نعرہ لگایا جائے، پارٹی کی آمریت ہو، یا ووٹ کی پرچی کے ذریعے اکثریت کو (وحی الٰہی کے برخلاف) حکمران قرار دے دیا جائے۔ یہ سب انسان پر انسان کی حکمرانی کی مختلف شکلیں ہیں جن کو اسلام قبول نہیں کرتا اور وہ انسانی سوسائٹی پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو آسمانی تعلیمات کے ذریعے نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔

رمضان المبارک میں کرسمس ڈے

قرآن کریم کی یہ دعوت آج بھی قائم ہے اور رمضان المبارک میں آنے والے کرسمس ڈے کے موقع پر ہم مسیحی برادری کو مبارکباد دیتے ہوئے یہی دعوت پیش کرتے ہیں کہ آؤ جس یسوع مسیح علیہ السلام کی ولادت کی دنیا بھر میں خوشیاں منارہے ہو اسی کی تعلیمات کی طرف واپس آجاؤ۔ اور آسمانی وحی کو ایک بار پھر انسانی سوسائٹی کی بنیاد بنانے کے لیے آگے بڑھو کیونکہ شخصی، گروہی اور اجتماعی سوچ و خواہشات کے ہاتھوں انسانی معاشرہ بہت چرکے کھا چکا ہے اور اس ''مسیحا'' کا منتظر ہے جو ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بار پھر آسمانی تعلیمات کے دامن میں واپس لے جائے۔

شرعی احکام و معاملات میں سورج اور چاند کی گردش کا اعتبار

(مارچ ۱۹۹۹ء کے دوران مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج یکم محرم الحرام ہے جو نئے ہجری سال کا پہلا دن ہے۔ ہجری سن کا آغاز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ہوتا ہے۔ یعنی آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے جس سال مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تھی وہاں سے ہجری سن شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ سن چودہ سو بیس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت کو چودہ سو انیس سال پورے ہو چکے ہیں اور بیسواں سال شروع ہے۔ ہجری نبویؐ سے اسلامی سن کے آغاز کا حکم سب سے پہلے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے دیا تھا اور اس کے بعد سے ہماری اسلامی تاریخ اسی حساب سے چلی آ رہی ہے۔

دنیا میں سورج اور چاند کی گردش کے حساب سے دو قسم کے سن رائج ہیں:

1. سورج کی گردش کے لحاظ سے جو سن رائج ہے وہ شمسی کہلاتا ہے اور جنوری، فروری اور مارچ وغیرہ مہینے اسی سن کے مہینے ہیں۔
2. جبکہ چاند کی گردش کے حساب سے جو سن مروّج ہے وہ قمری کہلاتا ہے اور محرم، صفر، ربیع الاول وغیرہ اس سن کے مہینے ہیں۔ ہجری سن قمری حساب سے ہے۔

مروّجہ شمسی سن عیسوی اور میلادی سن بھی کہلاتا ہے جس کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ہوتا ہے۔ اور ۱۹۹۹ء کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کو اتنے سال گزر چکے ہیں اور ان کی عمر اب دو ہزار سال کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔

دنیا میں اوقات اور ایام کے تعین کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا حساب چلتا ہے۔ البتہ سورج کی گردش والا سال چاند کی گردش والے سال سے چند دن بڑا ہوتا ہے اور گرمی سردی کے موسم بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں، اس لیے چاند کی گردش والا سال موسم کے حساب سے بدلتا رہتا ہے۔

اسلام میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار ہے اور شرعی احکام اور عبادات میں دونوں کا

لحاظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ دنوں اور مہینوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوتا ہے، جبکہ اوقات کا تعین سورج کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز کے اوقات سورج کی گردش کے ساتھ طے پاتے ہیں، فجر کی نماز طلوع شمس سے پہلے، ظہر کی نماز زوال کے بعد، عصر کی غروب سے پہلے، مغرب کی غروب کے بعد، اور عشاء کی نماز شفق کے خاتمہ پر پڑھی جاتی ہے اور ان سب اوقات کا تعین سورج کی گردش کے ساتھ ہے۔ البتہ رمضان المبارک، عیدین، ۱۰ محرم، حج کے ایام اور دیگر دنوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوتا ہے۔ اب روزے میں دیکھ لیجئے، روزہ کے دنوں کا تعین چاند کے حساب سے کریں گے، مگر روزے کے اوقات کا حساب سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔ سحری کا وقت سورج طلوع ہونے سے تھوڑا عرصہ پہلے تک ہے اور افطاری کا وقت سورج غروب ہونے پر ہوتا ہے۔ اس طرح حج کے دنوں کا تعین تو قمری اعتبار سے ہوگا مگر حج کے ارکان و افعال کا وقت سورج کے حساب سے طے پائے گا کہ عرفات کب جانا ہے، مزدلفہ کب جانا ہے، رمی کب کرنی ہے، یہ سب معاملات سورج کی گردش کے ساتھ طے ہوتے ہیں۔

الغرض شرعی احکام و معاملات میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا لحاظ رکھا گیا ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ دنوں کی تعیین چاند کے ساتھ جبکہ اوقات کی تعیین سورج کے ساتھ ہوگی، چنانچہ ہماری تمام عبادات و احکام اس حساب سے چلتے ہیں۔

اس فرق میں کیا حکمت ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً رمضان کا تعین اگر سورج کی گردش کے حساب سے طے کیا جائے تو جو مہینہ بھی طے پائے گا وہ ایک ہی موسم میں ہمیشہ آئے گا اور مختلف موسموں کے روزوں کا لطف نصیب نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر اکتوبر کا مہینہ روزوں کے لیے مخصوص ہوتا تو وہ ہر سال اسی موسم میں آتا۔ جبکہ قمری حساب سے رمضان المبارک کے تعین سے یہ تنوّع حاصل ہوتا ہے کہ مختلف موسموں کے روزے مل جاتے ہیں اور ایک مسلمان بالغ ہونے کے بعد پچاس برس کی عمر تک سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے، ٹھنڈے بھی، درمیانے بھی، اور گرم بھی، اور اس طرح تنوع قائم رہتا ہے۔

اجتہاد کا شرعی تصور اور ایک مغالطہ

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن دنوں ہمارے ہاں جولائی اور اگست کے روزے تھے، قومی اخبارات میں ایک صاحب کی طرف سے تجویز چھپی کہ جون جولائی کے روزے

بھٹی پر کام کرنے والے مزدور اور کھیتی میں محنت کرنے والے کاشتکار کے لیے بہت مشکل ہیں، اس لیے علماء کرام کو چاہیے کہ وہ ''اجتہاد'' کر کے رمضان المبارک کو کسی مناسب موسم کے ساتھ مخصوص کر دیں۔ ان صاحب کی تجویز یہ تھی کہ فروری کے مہینہ کو رمضان المبارک قرار دے دیا جائے اور یکم مارچ کو عید الفطر کے لیے مقرر کر دیا جائے، اس طرح نہ صرف روزے مناسب موسم میں مخصوص ہو جائیں گے بلکہ عید کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اس زمانے میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس غریب کو اپنی تجویز کا تیسرا فائدہ یاد نہیں رہا کہ تیسویں روزے سے ہمیشہ کے لیے چھٹی مل جائے گی اور ۲۹ واں روزہ بھی چار سال کے بعد آئے گا۔

ہمارے ہاں اس بات کو لوگوں نے اجتہاد سمجھ رکھا ہے کہ دین کے جس مسئلہ پر عمل میں کچھ مشکل محسوس ہو اس میں اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق ردوبدل کر لیا جائے۔ حالانکہ یہ اجتہاد نہیں، خالص الحاد ہے۔ اور پہلی امتوں نے اسی طرح آسمانی مذاہب کا حلیہ بگاڑا تھا۔ جیسا کہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیرِ مظہری میں روایات نقل کی ہیں کہ بنی اسرائیل میں رمضان المبارک ہی کے روزے فرض تھے، جو قمری سن کا مہینہ ہے اور موسم کے حساب سے مختلف موسموں میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اس زمانے میں بھی جون اور جولائی کے روزے لوگوں کو گراں گزرے تھے اور انہوں نے اپنے علماء کرام سے گزارش کی تھی کہ وہ انہیں شدید گرمی کے روزوں سے نجات دلائیں۔ بنی اسرائیل کے علماء کرام ہماری طرح کے ''ضدی اور ہٹ دھرم'' نہیں تھے بلکہ ''عوام دوست اور روشن خیال'' تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے عوام کی بات مان لی اور رمضان المبارک کے روزوں کو سردی کے موسم میں مخصوص کر دیا۔ البتہ تھوڑی سی شرم و حیا موجود تھی، اس لیے تیس روزوں کے اٹھائیس نہیں کیے بلکہ یہ طے کیا کہ تیس روزے تو پورے رکھیں گے، اور یہ جو گڑبڑ ہم کر رہے ہیں اس کے کفارے کے طور پر دس روزے مزید بھی رکھا کریں گے۔ چنانچہ مذہبی عیسائیوں کو دیکھ لیں کہ وہ مارچ اپریل کے دوران چالیس روزے رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بنی اسرائیل کی روایات کے حوالے سے اس کا یہ پس منظر بیان کیا ہے۔

روزہ کے اوقات اور زکوٰۃ کے سال کا تعیّن

الغرض بات یہ عرض کر رہا تھا کہ اسلام میں حسابات و معاملات طے کرنے اور عبادات کی ادائیگی کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مہینوں اور

دنوں کا تعین چاند کے حساب سے ہوگا، جبکہ اوقات سورج کی گردش کے ساتھ طے پائیں گے۔ اور اس میں حکمت بھی ہے کہ روزہ اور حج میں مختلف موسموں کا تنوّع قائم رہتا ہے۔ یہاں دو مسئلے بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں:

1. ایک یہ کہ چاند کی گردش میں چونکہ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے چاند کے طلوع وغیرہ کا حساب رکھنا فرضِ کفایہ ہے اور ہر علاقہ کے کچھ لوگوں کو اس کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ جس طرح ہمارے ہاں رؤیتِ ہلال کمیٹی ہے جس میں سرکردہ علماء کرام اس کا حساب رکھتے ہیں اور چاند دیکھ کر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر اس کا کوئی اہتمام بھی کسی علاقہ میں نہ ہو تو وہاں کے سب مسلمان گنہگار ہوں گے۔
2. دوسرا مسئلہ زکوٰۃ کے حوالے سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں عام طور پر کاروبار وغیرہ کے حسابات جنوری فروری کے شمسی سال کے مطابق رکھے جاتے ہیں، اور چونکہ سرکاری محکموں کے ساتھ سابقہ درپیش ہوتا ہے اس لیے حسابات میں شمسی سال کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر کوئی شخص شمسی سن یعنی جنوری فروری کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا تو تیس پینتیس سال کے عرصہ میں اس کی ایک سال کی زکوٰۃ ماری جائے گی، کیونکہ اتنے عرصہ میں قمری سال کی گنتی شمسی سالوں سے ایک سال بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کی جائے۔

ماہِ محرم اور رسومات

حضراتِ محترم! یہ چند گزارشات ہجری سن کے آغاز کی مناسبت سے عرض کی ہیں۔ اس کے علاوہ محرم الحرام کے ساتھ کچھ تاریخی یادیں بھی وابستہ ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنہوں نے ہجرت سے اسلامی سن کے آغاز کا حکم دیا تھا ان کی شہادت یکم محرم کو ہوئی۔ اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل کو نجات دس محرم کو حاصل ہوئی تھی، جب فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرق ہو گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ہمراہ سمندر عبور کر گئے تھے۔ اس مناسبت سے مدینہ منورہ کے یہودی دس محرم کو شکرانے کا روزہ رکھا کرتے تھے، اور جناب نبی اکرمؐ بھی اس دن روزہ رکھتے تھے۔ البتہ آخری سال یعنی ۱۰ ہجری کو فرمایا کہ

یہودیوں کے ساتھ اس روزے میں فرق رکھنا چاہیے اس لیے آئندہ سال دس محرم کے ساتھ ایک اور روزہ ملاؤں گا۔ چنانچہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اس دن روزہ رکھنا مسنون ہے مگر تنہا اس دن کا روزہ رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ نو یا گیارہ محرم کا روزہ بھی ملا لینا چاہیے۔

عاشورا کے بارے میں بعض تاریخی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دس محرم کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کنارے لگی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ ٹھنڈی ہوئی تھی، حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے اپنے پیٹ سے اگل کر پانی سے باہر ڈال دیا تھا، اور حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی، وغیر ذلک۔ اگر یہ روایات درست ہوں تو کوئی انکار نہیں ہے اور درست نہ ہوں تو کوئی اصرار بھی نہیں ہے۔ مگر بنی اسرائیل والی روایت تو بخاری شریف میں ہے۔

اس کے علاوہ دس محرم کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشہ اور نواسہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا، جنہیں خاندانِ نبوت کے دیگر معصوم افراد سمیت اس روز کربلا کے میدان میں مظلومیت کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ امام حسینؓ سمیت خانوادۂ نبوت کے افراد کی یہ مظلومانہ شہادت ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے، اور مختلف گروہ اس کی یاد اپنے اپنے انداز سے مناتے ہیں۔

ہمارے نزدیک دن منانے اور اس طرح کی دیگر رسموں کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ بزرگوں کو یاد کرنا، ان کی خدمات کا تذکرہ کرنا، اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کرنا اُن بزرگوں کا ہم پر حق ہے جو ہمیں ہر وقت ادا کرتے رہنا چاہیے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہوں، ان کی اصل یاد یہ ہے کہ ان کی قربانیوں اور خدمات کو یاد کیا جائے، ان کے مشن اور جدوجہد کا ادراک حاصل کیا جائے، ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے عزم کو دہرایا جائے اور ان کے اسوہ وسیرت پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت عدی بن حاتمؓ کی سحری

(۴ مئی ۱۹۹۹ء کو جامع مسجد دارالعلوم نعمانیہ، ڈیرہ اسماعیل خان میں خطاب)

حاتم طائی عرب کے مشہور سخی ہیں جن کی سخاوت کے قصے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا البتہ چونکہ وہ تاریخی روایات کے مطابق بت پرستی ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں رائج الوقت حق مذہب عیسائیت ہی تھا اس لیے حاتم طائی کو اہلِ حق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا بیٹا عدیؓ اور بیٹی سفانہؓ دونوں صحابی ہیں۔

عدی بن حاتمؓ کا قصہ ہے کہ جب رمضان المبارک میں سحری کا حکم نازل ہوا کہ اس وقت تک سحری میں کھا پی سکتے ہو جب تک سفید اور سیاہ دھاریاں الگ الگ ظاہر نہ ہو جائیں۔ یہاں قرآن کریم کی مراد طلوعِ فجر کے وقت مشرق کی جانب آسمان پر نظر آنے والی سفید روشنی اور سیاہ اندھیرے کی دھاریاں ہیں جن کا الگ الگ نظر آنا طلوعِ فجر کی علامت ہے اور اسی کے ساتھ سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ مگر عدی بن حاتمؓ نے یہ کیا کہ دھاگے کی سفید اور سیاہ ڈوریاں اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیں اور سحری کے وقت انہیں دیکھ کر کھاتے پیتے رہتے، اور جب وہ الگ الگ دکھائی دینے لگتیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک روز جناب رسول اکرمؐ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ اذا لوسادتک عریض یا عدی پھر تو اے عدیؓ! تیرا تکیہ بہت چوڑا ہے۔ یعنی سفید اور سیاہ دھاریوں سے قرآن کریم نے جو مراد لیا ہے وہ اگر تیرے تکیے کے نیچے آجاتا ہے تو پھر تو تکیہ بہت چوڑا ہو گا۔ اس کے بعد آپؐ نے قرآن کریم کی مراد واضح کی تو عدی بن حاتمؓ بات سمجھے اور تکیہ کے نیچے سے دھاگے کی ڈوریاں نکال دیں۔

غور فرمائیے کہ عدی بن حاتمؓ عرب ہیں، عرب کے بیٹے ہیں، سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں مگر قرآن کریم کا بیان کردہ محاورہ سمجھنے میں غلطی لگ گئی اور اس وقت تک قرآن کریم کا مطلب نہیں سمجھ پائے جب تک خود حضورؐ نے اس کی وضاحت نہیں فرما دی۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ محض عربی دانی کے زور پر قرآن کریم کے مفہوم و مراد کو پا سکتا ہے تو یہ بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔

رمضان کریم، قرآن کریم اور نومسلم خواتین

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء)

رمضان المبارک میں نبی اکرمؐ اور حضرت جبریلؑ کی قراءت و سماعت

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس میں قرآن کریم لوحِ محفوظ سے نازل ہوا اور اسی میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں باقی سال کی بہ نسبت قرآن کریم کی تلاوت زیادہ کیا کرتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام رمضان المبارک میں اہتمام کے ساتھ تشریف لاتے اور آنحضرتؐ کے ساتھ اس سال تک نازل ہونے والے قرآن کریم کا دور کرتے تھے۔ آخری سال حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو دفعہ دور کیا جس کے بارے میں محدثین کا کہنا ہے کہ یہ جناب رسول اللہؐ کے لیے اشارہ تھا کہ اگلے سال موقع نہیں ملے گا۔

حفاظ کرام، دنیا کے ہر خطہ میں

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا ایک پہلو ہے کہ دنیا میں لاکھوں سینوں میں ہر دور میں محفوظ رہتا ہے اور روزمرہ تلاوت کے علاوہ رمضان المبارک کے دوران لاکھوں مساجد میں اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس قسم کی باتیں عام طور پر سننے میں آتی تھیں کہ اس طرح الفاظ کو رٹنے اور بلا سمجھے دہرائے چلے جانے کا کیا فائدہ تھا؟ لیکن جوں جوں اس قسم کے اعتراضات و شبہات زیادہ ہوئے اس سے کہیں زیادہ قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بستیوں میں جہاں آج سے ربع صدی قبل تراویح میں قرآن کریم سنانے کے لیے ایک حافظ بھی میسر نہیں آتا تھا، وہاں اب ایک ایک مسجد میں کئی کئی حافظِ قرآن موجود ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں یہ بھی قرآن کریم کے اعجاز کا اظہار ہے۔

نوریہ کا قبولِ اسلام

مگر اس مناسبت سے قرآن کریم کے اعجاز کے ایک اور پہلو کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو گزشتہ روز ”نومسلم خواتین کی آپ بیتیاں“ نامی ایک کتاب کے مطالعہ کے دوران نظر سے گزرا۔ یہ کتاب محترمہ نگہت عائشہ نے ترتیب دی ہے اور اس میں مختلف ممالک کی ستر نومسلم خواتین کی آپ بیتیاں شامل کی گئی ہیں۔ پونے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب ندوۃ المعارف ۱۳ کبیر اسٹریٹ اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے اور اس میں جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے ایک سفرنامے کو بطور دیباچہ شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے لندن کے معروف روزنامہ لندن ٹائمز کی ۹ نومبر ۱۹۹۳ء کی ایک رپورٹ کی بنیاد پر ماضی قریب میں مسلمان ہونے والی بعض نومسلم خواتین کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ ان میں اسکاٹ لینڈ کی ایک خاتون کا تذکرہ بھی ہے جو ۱۹۷۴ء میں مسلمان ہوئیں اور انہوں نے اپنا اسلامی نام ”نوریہ“ رکھا۔ اس خاتون کے قبولِ اسلام کی وجہ ”ٹائمز“ کی رپورٹ کے مطابق یہ تھی کہ انہیں (نعوذ باللہ) ردی میں قرآن کریم کے کچھ اوراق ملے جن کے مطالعہ سے انہیں قرآن کریم کے باقاعدہ مطالعہ کا شوق ہوا۔ اور جب انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو اسلام قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

مارسیہ کا قبولِ اسلام

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کا مطالعہ آج بھی بھٹکے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا سبب بنتا ہے بشرطیکہ وہ مطالعہ ہماری طرح رسمی اور روایتی نہ ہو۔ یہ واقعہ پڑھ کر مجھے نوسال پرانا ایک اور واقعہ یاد آگیا جب امریکہ سے ایک نومسلم خاتون گوجرانوالہ آئیں اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے مہتمم مولانا صوفی عبدالحمید سواتی سے ملاقات کے علاوہ ہمارے گھر بھی تشریف لائیں۔ اس خاتون کے قبولِ اسلام کی وجہ قرآن کریم کا مطالعہ بنا اور یہ واقعہ انہوں نے خود ہمیں سنایا۔ خاتون کا پہلا نام ”مارسیہ کے ہر مینسن“ تھا اور ایم کے ہر مینسن کہلاتی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے نام کا مخفف قائم رکھنے کے لیے اسلامی نام مجاہدہ رکھ لیا اور اس طرح ان کے نام کا مخفف ایم کے ہر مینسن قائم رہا۔

اس نومسلم خاتون کا کہنا تھا کہ فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہیں ذہنی طور پر ایک خلا محسوس ہوتا تھا اور کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ اسی سکون کی تلاش میں وہ مختلف ملکوں میں

گھومتی رہیں اور یونیورسٹیوں میں کورسز کرتی رہیں۔ اسی دوران اسپین کی کسی یونیورسٹی میں وہ اپنے ہاسٹل میں تھیں کہ ایک روز ریڈیو کی سوئی گھماتے ہوئے ایک جگہ سے عجیب سی پر کشش آواز سنائی دی۔ آواز میں کشش تھی مگر زبان سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک دو دفعہ سننے کے بعد مختلف حضرات سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ مراکش ریڈیو ہے اور اس وقت مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کا سننا معمول بن گیا۔ قرآن کریم کا انگلش ترجمہ منگوا کر پڑھا مگر لطف نہ آیا تو عربی زبان کا کورس کیا۔ زبان سے مانوس ہو کر براہ راست قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور مسلمان ہوگئیں۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے اس کے بعد مختلف اسلامی تحریکات اور شخصیات کا مطالعہ کیا اور سب سے زیادہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر ہوئیں۔ حتیٰ کہ ''مغرب اور شاہ ولی اللہ کا تعارف'' کے موضوع پر برکلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس وقت وہ کیلی فورنیا کی سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ کی استاذ ہیں اور انہوں نے اسی یونیورسٹی میں امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و تعلیمات پر ریسرچ کے لیے ''شاہ ولی اللہ چیئر'' قائم کر رکھی ہے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الاراء تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا انگلش ترجمہ بھی کیا ہے اور مختلف جرائد میں شاہ صاحبؒ کے بارے میں مضامین لکھتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی پروفیسر محمد علوی سے شادی کی۔ وہ ۱۹۹۰ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ پاکستان آئیں تو گوجرانوالہ بھی تشریف لائیں۔ انہیں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری کے دوران ہمارے چچا محترم مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کی بعض تصنیفات سے استفادہ کا موقع ملا تھا، وہ اسی نسبت سے ان سے ملاقات و گفتگو کے لیے آئی تھیں۔ میں بھی اس ملاقات میں شریک تھا۔ ان سے حضرت صوفی صاحب نے یہ سوال کیا تھا کہ آج کے دور میں ہم مسلمانوں میں تو کوئی ایسی کشش کی بات نہیں ہے جسے دیکھ کر کوئی غیر مسلم مسلمان ہو، اور آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں آپ کیسے مسلمان ہوگئی ہیں؟ اس کے جواب میں محترمہ نے کہا کہ وہ کسی مسلمان سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوئی ہیں۔ اور پھر انہوں نے یہ سارا واقعہ سنایا جس کا تذکرہ سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کا یہ اعجاز آج بھی قائم ہے کہ وہ ہر ایک کو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے بشرطیکہ کوئی اسے اس نیت سے پڑھے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کی نوریہ کے لیے ردی کی ٹوکری میں پڑے قرآن کریم کے

چند اوراق ہدایت کا باعث بن سکتے ہیں، اور امریکہ کی مارسیہ کو مراکش ریڈیو سے نشر ہونے والی قرآن کریم کی آواز ہدایت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے، تو ہماری مسجدوں، گھروں اور محفلوں میں شب و روز اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جانے والا قرآن کریم ہمیں گمراہی، اخلاق باختگی، کرپشن اور بے راہ روی کی دلدل سے کیوں نہیں نکال سکتا؟ بات صرف لائن سیدھی کرنے کی ہے، اس لیے کہ کنکشن درست ہو اور بلب فیوز نہ ہو چکا ہو تو "پاور ہاؤس" کو روشنی منتقل کرنے میں بخل سے کام لینے کی آخر کیا ضرورت ہی کیا ہے؟

حافظِ قرآن کریم کا ایک بڑا اعزاز

(۲۵ نومبر ۲۰۰۰ء کو اسلامک دعوہ اکیڈمی، لیسٹر، برطانیہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اسلامک دعوۃ اکیڈمی لیسٹر کا یہ سالانہ اجتماع بہت سے حوالے اور مناسبتیں رکھتا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ اکیڈمی میں قرآن کریم مکمل کرنے والے ایک حافظ کی دستار بندی ہونے والی ہے، اور ویسے بھی رمضان المبارک کا برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ چند دنوں میں شروع ہو رہا ہے اس لیے میں اسی مناسبت سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

رمضان المبارک میں قرآن کریم کا نزول ہوا تھا اس لیے یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی وجہ سے اس ماہ میں باقی سارے سال کی بہ نسبت قرآن کریم کی تلاوت زیادہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا پاک کلام کثرت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ قرآن کریم کا پڑھنا اور سننا دونوں عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ یہ ہے کہ آپؐ قرآن کریم کی تلاوت تو اہتمام سے کرتے ہی تھے مگر اس کے ساتھ اس کے سننے کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے اعزازات

صحابہ کرامؓ میں حضرت ابی بن کعبؓ بہت بڑے قاری ہیں بلکہ

1. ایک ارشاد گرامی میں جناب نبی اکرمؐ نے انہیں امت کا سب سے بڑا قاری ہونے کا خطاب دیا ہے اور یہ ان کے بڑے اعزازات اور امتیازات میں سے ہے۔
2. ان کا دوسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح کے دوران قرآن کریم مکمل پڑھنے اور سننے کی جو سنت چودہ سو برس سے جاری ہے، اس کا آغاز اُن سے ہوا تھا، اور مسجد نبویؐ میں تراویح کے دوران سب سے پہلے انہوں نے قرآن کریم سنایا تھا۔
3. ان کا تیسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ ایک بار جناب رسول اللہؐ نے بلا کر ان سے فرمائش کی کہ وہ آپؐ کو قرآن کریم سنائیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں آپ کو قرآن کریم سناؤں، آپ پر تو خود قرآن کریم نازل ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہاں تم

مجھے قران کریم سناؤ، اس لیے کہ ابھی حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے اللہ تعالیٰ کا پیغام دیا ہے کہ ابی بن کعبؓ کو بلا کر اس سے قرآن کریم کی سورۃ البینہ سنو۔ اس پر حضرت ابی بن کعبؓ کو اور زیادہ تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے؟ آنحضرتؐ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت ابی بن کعبؓ نے خوشی سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ حضورؐ کو قرآن کریم کی یہ سورت سنائی۔

اس لیے قرآن کریم سننے کا اہتمام کرنا بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور رمضان المبارک میں تراویح میں یہ سنت جاری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کریم کم از کم ایک بار ضرور نماز کی حالت میں سن لیا جائے۔

قرآن کریم یاد رکھنے کا فریضہ

قرآن کریم حفظ کرنا اور حافظ ہونا بہت بڑی سعادت کی بات ہے لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے کیونکہ قرآن کریم پورا یاد کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر یاد کر لیا جائے تو اس کو ساری زندگی یاد رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا مگر اپنی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے بھول گیا تو قیامت کے روز وہ کوڑھا کر کے اٹھایا جائے گا۔ لیکن اگر قرآن کریم یاد کرنے والا ساری زندگی اسے یاد رکھے اور اس کے احکام پر عمل بھی کرے، تو اس کے اعزازات بہت ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قیامت کے روز بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا جن میں سے صرف ایک کا آج تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

روزِ قیامت حافظِ قرآن کا اعزاز

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا، یاد کرنے کے بعد اسے یاد رکھا، اور اس کے احکام پر عمل بھی کیا، اس حافظ سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اپنے خاندان کے ایسے دس افراد کو اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ جن کے بارے میں دوزخ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ حافظ قرآن کریم کا کوٹہ ہے کہ وہ دس جہنمیوں کو جہنم کے دروازے سے واپس لا کر جنت میں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جب قرآن کریم پر عمل کرنے والا حافظ قیامت کے دن دس افراد کی نجات کا کوٹہ لے کر کھڑا ہو گا، ساری برادری اس کے گرد جمع ہو کر امید

بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوگی، اور وہ ان میں سے دس افراد کا انتخاب کر کے انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے جانے کے لیے بلا رہا ہو گا، تو تب پتہ چلے گا کہ حافظ قرآن کریم کتنا بڑا وی آئی پی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ اور وی آئی پی کا لفظ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد کا ترجمہ کر رہا ہوں اشراف امتی حملة القرآن کہ میری امت کے اشراف قرآن کریم کو اٹھانے والے ہیں۔

حافظِ قرآن، ہر خاندان کی ضرورت

اس مناسبت سے میں ایک اور بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں اور آپ سب اس بات پر غور کر لیں کہ کل قیامت کے دن اگر ہمارے معاملات کا فیصلہ میرٹ اور فائل پر کرنے کا اعلان ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ جس طرح کی زندگی ہم گزار رہے ہیں اور ہمارے شب و روز کے جو معمولات ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم میں سے کون اپنی فائل اور میرٹ پر کسی بھی درجہ میں اعتماد کر سکتا ہے؟ ہمارے پاس کون سا میرٹ ہے اور ہماری فائل میں آخر ہے ہی کیا؟ اس لیے ہماری نجات تو اسی طرح کے کسی کوٹے میں شامل ہو کر ہو گئی تو کچھ امید ہے، ورنہ اور تو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ لہٰذا میری گزارش ہے کہ ہر خاندان کو اپنے لیے چار پانچ ضمانتیوں کا انتظام بہرحال کر ہی لینا چاہیے۔ کسی خاندان میں پانچ حافظ ہوں گے تو پچاس کا، دس ہوں گے تو سو افراد کی نجات کا بندوبست ہو جائے گا۔

ان گزارشات کے ساتھ قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے نوجوان، اس کے والدین، اساتذہ اور اسلامک دعوہ اکیڈمی کے منتظمین و معاونین کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس نوجوان کو قرآن کریم کو یاد رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تعلیم کو فروغ دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

خوشیوں اور کامیابیوں کی قدردانی کی ضرورت

(عید الفطر ۱۴۲۲ھ (۲۰۰۱ء) کے موقع پر مرکزی عید گاہ اہلسنت گوجرانوالہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج عید کا دن ہے، عید خوشی کو کہتے ہیں اور آج دنیا بھر کے مسلمان اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خوشی اور تشکر کا اظہار کر رہے ہیں کہ رمضان المبارک کا رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ نصیب ہوا، اور اس میں ہر مسلمان کو اپنے ذوق اور توفیق کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بندگی اور نیک اعمال کا موقع ملا۔ روزہ، قرآن کریم کا سننا سنانا، صدقہ خیرات اور نوافل کی توفیق ہوئی، اس خوشی میں مسلمان بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہیں اور تشکر و امتنان کا اظہار کر رہے ہیں۔

شکر گزاری اور ناشکری کا ضابطہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورۃ ابراہیم کی آیت ۷ میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

”اگر تم میری نعمتوں پر شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔“

یعنی جس طرح شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح ناشکری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب اور سزا بھی دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور ضابطہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جو نعمتیں خود انسانوں کی فرمائش پر انہیں دی جاتی ہیں، ان کی ناشکری پر عذاب بھی سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

میں نے آج خطبہ کے بعد سورۃ المائدۃ کی جو آیات کریمہ (۱۱۲ تا ۱۱۵) آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ان میں اللہ رب العزت نے اسی ضابطہ اور قانون کی وضاحت کی ہے اور ایک تاریخی واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ سورۃ المائدۃ اسی واقعہ سے منسوب ہے۔

”مائدہ“ دستر خوان کو کہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اترنے کا واقعہ اس سورہ میں بیان ہوا ہے جس کی وجہ سے اس سورۃ کو ”المائدۃ“

کہا جاتا ہے، وہ واقعہ انہی آیات میں ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ:

"اور جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ کا رب اس کی طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے خوان اتارے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ حواریوں نے کہا کہ ہم یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں گے جس سے ہمارے دلوں کو اطمینان نصیب ہوگا اور ہم یہ جان لیں گے کہ آپ نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ہم پر خوان اتار دے۔ وہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہوگی اور آپ کی قدرت کی نشانی ہوگی، آپ ہمیں رزق عطا فرمادیں کیونکہ آپ بہترین رزق دینے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر خوان اتار دوں گا مگر اس کے بعد تم میں سے جس نے ناشکری کی تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ وہ عذاب اس کائنات میں اور کسی کو نہیں دوں گا۔"

یعنی جس نعمت کی فرمائش کی جارہی ہے اس کے ملنے کے بعد بھی اگر ناشکری کی گئی تو اس پر خدا کا عذاب بہت زیادہ سخت اور بے مثال ہوگا اور اس کی سنگینی اور شدت دوسرے عذابوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔

بنی اسرائیل کا "مائدہ" کا واقعہ

ان آیات کے ضمن میں امام ابن جریر طبریؒ نے "تفسیر طبری" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے "تفسیر مظہری" میں حکیم ترمذیؒ کی "نوادر الاصول" کے حوالے سے حضرت سلمان فارسیؓ کی تفصیلی روایات نقل کی ہیں، ان دونوں کو سامنے رکھ کر واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ان روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو جب روزہ رکھنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر تم ایک ماہ کے روزے رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول کریں گے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایک ماہ مسلسل روزے رکھے اور جب تیس روزے مکمل ہو گئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب ہم ایک ماہ تک کسی کے ہاں مزدوری اور کام کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنی طرف سے کھانا کھلاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست

کریں کہ وہ ہمارے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اتارے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انہیں تنبیہ کی کہ خدا سے ڈرو، اس قسم کے سوالات مناسب نہیں، لیکن جب وہ اپنے سوال پر قائم رہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خوان اتارنے کی درخواست کر دی۔ جس پر اللہ رب العزت نے خوان اتارنے کا وعدہ کر لیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر اس کے بعد بھی ناشکری کی تو پھر میرا عذاب ایسا ہوگا کہ اس کی مثال پوری کائنات میں نہیں ہوگی۔ چنانچہ آسمان سے تیار کھانوں کا دسترخوان اترا بلکہ مسلسل چالیس دن تک اترتا رہا اور بنی اسرائیل سب کے سب روزانہ اس سے کھاتے رہے۔

چالیس دن کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش شروع ہوئی اور حکم ہوا کہ آج کے بعد یہ خوان غریب اور مستحق لوگوں کے لیے ہوگا، اور امیر اور صاحب استطاعت افراد کو اس سے کھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے قبل یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ دسترخوان پر بیٹھ کر جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ مگر ساتھ لے جانے اور ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور دسترخوان سے کوئی چیز اٹھا کر لے جانے کو خیانت شمار کیا جائے گا۔ مگر امیر لوگ اور صاحب استطاعت افراد ان شرائط کی پابندی نہ کر سکے اور طرح طرح کے حیلے نکال کر خلاف ورزی شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے یہ خوان اترنا بند ہو گیا اور خلاف ورزی کرنے والے سینکڑوں افراد کو یہ عذاب ہوا کہ رات کو بے فکری کے ساتھ اپنے بستروں پر محوِ خواب تھے کہ ان کی شکلیں بدل گئیں اور انہیں خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ صبح اٹھے تو عجیب صورتحال تھی۔ دھڑ اور جسم انسانوں کے تھے مگر چہرے اور شکلیں خنزیروں کی بن چکی تھیں۔ بنی اسرائیل میں کہرام مچ گیا، سب لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد جمع ہو کر آہ و زاری کرنے لگے۔ وہ سینکڑوں خنزیر نما انسان بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد گھومتے اور روتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی کا نام لے کر پکارتے تو وہ سر ہلا کر ہاں کرتا مگر گفتگو کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ ان کا رونا دھونا بعد از وقت تھا اس لیے کسی کام نہ آیا۔ اور وہ خنزیر نما سینکڑوں انسان تین دن اس حال میں رہنے کے بعد موت کا شکار ہو گئے، ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور نہ ہی کسی کی نسل آگے چلی۔

گویا اس واقعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کا عملی اظہار فرما دیا کہ وہ عام نعمتوں کی ناشکری پر بھی سزا دیتے ہیں، لیکن جو نعمت فرمائش اور درخواست کر کے لی جائے اس کی ناشکری پر ان کا عذاب بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔

عربوں کی دولت کی ناقدری

اس حوالے سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد گرامی بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے یہ واقعہ بیان کر کے عربوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔ تفسیر ابن کثیرؒ میں انہی آیات کریمہ کے ضمن میں منقول ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایک مجلس میں ''مائدہ'' والا یہ واقعہ بیان فرمایا اور پھر کہا کہ اے اہل عرب! تم پر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم پیغمبر تمہیں عطا فرمائے۔ حالانکہ ان سے پہلے تم صرف اونٹ اور بکریاں چرانے والے چرواہے تھے لیکن رسول اللہ کی برکت سے تمہیں عرب وعجم کی بادشاہت مل گئی۔ اور نبی اکرمؐ نے تمہیں ہدایت کی کہ سونا چاندی ذخیرہ نہ کرنا، یعنی دولت کو جمع کرنے کے بجائے اسے مستحقین پر خرچ کرتے رہنا، مگر تم نے دولت کو ذخیرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ تم بھی اسی طرح خدا کے عذاب کا شکار ہو گے جس طرح مائدہ والے بنی اسرائیل خدا کے عذاب میں مبتلا ہوئے تھے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ نے یہ بات اپنے دور کے پس منظر اور حالات میں کہی تھی لیکن آج کے حالات اور تناظر میں ان کے اس ارشاد گرامی کو دیکھ لیجئے کہ کس طرح حرف بہ حرف صادق آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ پون صدی میں عربوں کو تیل اور سونے کی صورت میں جس دولت سے مالامال کیا، اس کی مثال نہیں ملتی، لیکن یہ دولت کہاں خرچ ہوئی؟ یہ دولت ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی اور ملی مفاد میں خرچ ہوتی تو اس کا میدان سائنس، ٹیکنالوجی، دفاع اور معیشت تھا۔ مگر عربوں کی دولت ان معاملات میں مسلمانوں کے کسی کام نہ آئی اور نہ ہی غریب مسلمانوں اور نادار لوگوں کی ضروریات پر یہ دولت صرف کی گئی۔ البتہ عیاشی پر، اللّوں تللّوں پر، بیکار بلڈنگوں پر اور شاہانہ اخراجات پر تیل کی دولت برباد ہو گئی۔ اور جو دولت ان کاموں پر صَرف نہ ہو سکی وہ مغربی ملکوں کے بینکوں میں ذخیرہ کر دی گئی ہے، جو مسلمانوں کے بجائے ان کے دشمنوں کے تصرف میں ہے اور ان کے کام آرہی ہے۔

اللہ نے چھپر پھاڑ کر عربوں کو دولت دی تھی، زمین کا سینہ ان کے لیے چاک کر دیا تھا، مگر انہوں نے اس عظیم نعمت کی جو ناشکری کی، اس کی سزا آج ہم سب بھگت رہے ہیں اور اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک کے سامنے تمام عرب ممالک بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ نعمتیں بھی بے حساب دیتا ہے مگر ان کی ناشکری پر اس کی گرفت بھی بڑی سخت اور عبرتناک ہوتی ہے۔

پاکستان کی نعمت کی ناقدری

عربوں کو ایک طرف رکھیے، خود ہمارا حال کیا ہے؟ ہم نے یعنی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے پاکستان جیسی عظیم نعمت اللہ تعالیٰ سے مانگ کرلی تھی اور یہ کہا تھا کہ یا اللہ! اس خطہ کے مسلمانوں کو الگ ملک عطا فرمادے، ہم اس میں تیرے احکام کی پابندی کا اہتمام کریں گے، ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں بخاری شریف تھی، اور ہم نے لاکھوں کے اجتماع میں عہد کیا تھا کہ پاکستان بن گیا تو ان دو کتابوں کی حکمرانی قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں الگ ملک دے دیا اور پاکستان بن گیا مگر ہم نے کیا کیا؟ اور نصف صدی سے مسلسل کیا کر رہے ہیں؟ ہم نے مملکتِ خداداد پاکستان کو لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا مرکز بنا لیا۔ ہم میں سے جس کا جتنا داؤ چلا اس نے ملک کو لوٹنے اور اس کے وسائل کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم نے خدا کے قانون کو، اسلام کے نظام کو اور قرآن و سنت کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور خواہشات کی غلامی میں لگ گئے۔ آج غریب آدمی کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ہے، بجلی کا بل دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں، کھانے کو روٹی نہیں ہے، اور سر چھپانے کو مکان نہیں ہے، مگر چند افراد نے اپنی تجوریوں اور بیرون ملکوں بینکوں میں دولت کے انبار لگا رکھے ہیں۔

آج مجھے اور آپ سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم تو عید کے روز نئے کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور بنے سنورے بیٹھے ہیں مگر ہمارے اردگرد کتنے لوگ ہیں جو آج کے دن بھی اپنے بچوں کے لیے ایک دن کی عارضی خوشیوں کا اہتمام نہیں کر سکے۔ ان کی تعداد تھوڑی نہیں بہت زیادہ ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، ان لوگوں کا بھی وہی خدا ہے جو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کے دلوں سے بھی آہیں نکلتی ہیں جو سیدھی عرش پر جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیں بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، سبق لینا چاہیے اور نصیحت پکڑنی چاہیے۔ ابھی وقت ہے اگر ہم ندامت اور توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح کا راستہ اختیار کرلیں تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے، لیکن اگر ہم نے اب بھی سبق نہ سیکھا تو عذاب کا قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاح اور توبہ کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حفاظتِ قرآن کا تکوینی نظام

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء)

قراءت وسماعت کی ملی روایت

رمضان المبارک قرآنِ کریم کا مہینہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآنِ کریم کا نزول ہوااور اس میں قرآنِ کریم کی تلاوت عام دنوں سے بڑھ جاتی ہے۔ ہر دیندار مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس مبارک ماہ کے دوران وہ قرآنِ کریم کی اہتمام کے ساتھ تلاوت کرے اور تراویح اور نوافل میں قرآنِ کریم سننے کی سعادت حاصل کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام ہے کہ عام طور پر سال بھر کی غفلت اور بے توجہی کی کسی نہ کسی حد تک اس مہینہ میں تلافی ہو جاتی ہے، اور ایمان اور عمل کی بیٹری ایک سال کے لیے پھر چارج ہوجاتی ہے۔

اس بات کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل امر ہے کہ انفرادی طور پر قرآنِ کریم کی تلاوت اور سننے اور سنانے سے ہٹ کر اجتماعی طور پر تراویح اور نوافل میں اس ماہ کے دوران دنیا بھر میں کتنی بار قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے؟ اعداد و شمار جمع کرنے کا کوئی جدید ترین سسٹم بھی شاید دنیا میں رمضان المبارک کے دوران قرآنِ کریم سننے اور سنانے کے حوالے سے اعداد و شمار کو مرتب کرنے کی مہم سر نہ کر سکے۔ یہ قرآنِ کریم کا اعجاز بھی ہے اور اس کی حفاظت کا ایک ”فول پروف سسٹم“ بھی کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کو اتنی بار دہرایا جائے اور اتنی بار سنا اور سنایا جائے کہ اس میں کسی حرف کے داخلہ یا کسی حرف کی کمی کا کسی سطح پر کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی بے نیاز ہے اور اس کی صفات بھی بے نیاز ہیں، اس لیے قرآنِ کریم کو بھی حفاظت کے ظاہری اسباب سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی بقا اور حفاظت کے ظاہری اسباب چمڑا، تختی، کاغذ، قلم، ڈسک، سی ڈی اور کیسٹ وغیرہ ہیں۔ یہ اسباب موجود ہوں تو کتاب کا وجود بھی ہے، اور اگر خدانخواستہ ان اسباب کا وجود باقی نہ رہے تو کسی کتاب کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ لیکن قرآنِ کریم ان تمام اسباب سے بے نیاز ہے کہ ان میں سے ایک سبب بھی باقی

نہ رہے تب بھی قرآنِ کریم پر اس کا رتی بھر اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہ لاکھوں سینوں کی کیسٹوں میں محفوظ ہے اور اتنی بار پڑھا اور سنا جاتا ہے کہ کتاب کے وجود اور بقا کے ظاہری اسباب کی موجودگی یا غیر موجودگی اس کے لیے ایک جیسی ہوگئی ہے۔

مصنوعی قرآن کی اشاعت کے منصوبے

چند سال قبل کی بات ہے میں کراچی میں تھا، جامعہ انوار القرآن گرین ٹاؤن کراچی میں چند نوجوان ملاقات کے لیے آئے اور اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا کہ مختلف غیر مسلم گروپوں نے قرآنِ کریم کے حوالے سے انٹرنیٹ پر ویب سائٹس بنا رکھی ہیں جن پر وہ قرآنِ کریم کی سورتوں اور آیات کے ساتھ ساتھ اس سے ملتی جلتی سورتیں اور آیات اپنی طرف سے گھڑ کر قرآنی آیات اور سورتوں کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں، جن سے ایک ناواقف شخص الجھن اور دھوکہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے چند سورتوں کے پرنٹس بھی دیے جو قرآن کریم کی طرز پر گھڑی گئی ہیں اور انہیں قرآنی سورتوں کے انداز میں ان ویب سائٹس پر دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض سورتوں اور آیات میں قرآنی تعلیمات کا مذاق اڑایا گیا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گستاخانہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے ان نوجوانوں سے عرض کیا کہ ان کی پریشانی بجا ہے۔ ہر مسلمان کو قرآن کریم کے بارے میں اس قسم کی صورتحال پر پریشان ہونا چاہئے اور یہ پریشانی قرآنِ کریم کے ساتھ ایک مسلمان کی محبت کی علامت ہے۔ کیونکہ غیرت اور غصہ وہیں آتا ہے جہاں محبت ہوتی ہے، اور جہاں عقیدت و محبت نہ ہو وہاں نہ کسی کو غصہ آتا ہے اور نہ ہی اس کی غیرت جوش مارتی ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس پریشانی اور غیرت پر آپ حضرات بڑے اجر و ثواب کے مستحق ہیں لیکن اس پریشانی کو خود پر مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کی حرکتوں سے قرآنِ کریم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اس طرح کے سینکڑوں گروپ بھی انٹرنیٹ پر قائم اور متحرک ہو جائیں تو وہ قرآنِ کریم کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

جانچ و پڑتال کا سادہ طریقہ

میرے اس جواب پر ان میں سے ایک نوجوان نے حیرت بلکہ قدرے خفگی کا اظہار کیا تو میں نے وضاحت کی کہ انٹرنیٹ کے جن دو چار گروپوں کی آپ بات کر رہے ہیں ان جیسے بیسیوں گروپ اور وجود

میں آجائیں، اور قرآنِ کریم کی ایک سو چودہ سورتوں کے ساتھ ان سے ڈبل تعداد میں سورتیں گھڑ کر بیسیوں ویب سائٹس کے ذریعے سامنے لے آئیں، تو ہمیں ان سب کے کام کو واچ کرنے اور اس کی چھانٹی کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے بندوبست کی ضرورت نہیں پڑے گی، بس پندرہ سال کا ایک ایسا بچہ کافی ہو گا جس نے قرآنِ کریم یاد کرنے کے بعد چار پانچ دفعہ سنا لیا ہے۔ اور ایسے بچے پندرہ سال کی عمر میں ہزاروں مل جائیں گے۔ اس بچے کو کمپیوٹر کی سکرین کے سامنے بٹھا دیں اور اس کے سامنے سے ان انٹرنیٹ گروپوں کا قرآن کریم کے بارے میں مذکورہ عمل گزارنا شروع کر دیں۔ وہ بچہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ ایک دن اور رات میں اس سارے کام کی چھانٹی کر کے رکھ دے گا کہ

- یہ سورۃ صحیح ہے اور یہ جعلی ہے،
- اس سورۃ میں یہ آیت صحیح ہے اور یہ جعلی ہے،
- اس آیت میں یہ لفظ صحیح ہے اور یہ جعلی۔

وہ بچہ قرآنِ کریم کے ایک لفظ کا ترجمہ نہیں جانتا، اور کسی ایک سورۃ کا مفہوم اور شانِ نزول بھی اس کے علم میں نہیں ہے، اور قرآنِ کریم کا عالم نہیں ہے بلکہ صرف حافظ ہے اور اس نے طوطے کی طرح قرآن کریم کے الفاظ رٹنے اور سننے سنانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا، لیکن انٹرنیٹ کے اس جدید ترین اور سائنٹفک ورک کو جانچنے اور اس کی چھانٹی کرنے کی لیے وہ بچہ کافی ہے۔ چنانچہ جس کام کو جانچنے اور چھانٹنے کے لیے پندرہ سال کا ایک بچہ کافی ہو اس سے قرآنِ کریم کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہ قرآنِ کریم کی حفاظت کا تکوینی نظام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے قرآنِ کریم میں کسی ردوبدل اور اس کے کسی لفظ کے آگے پیچھے ہونے کا کوئی امکان کسی درجہ باقی نہیں رہا۔

رمضان المبارک قرآنِ کریم کو سننے وسنانے اور پڑھنے ودہرانے کا خاص مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اہتمام کے ساتھ قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے، سنا جاتا ہے، سنایا جاتا ہے، دہرایا جاتا ہے اور پورا سال غفلت میں گزارنے کے بعد مسلمان ایک بار پھر قرآنِ کریم کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کر لیتے ہیں۔ رمضان المبارک آخری مراحل میں ہے اور قرآنِ کریم کے نزول اور تکرار وتلاوت کا یہ مبارک مہینہ چند دنوں میں ہم سے رخصت ہونے والا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ مہینہ ہمارے لیے قرآنِ کریم کے ساتھ اپنے تعلقات ومعاملات کو درست کرنے کا ذریعہ ثابت ہو، اور یہ مبارک مہینہ ہمیں صحت وعافیت اور توفیق وقبولیت کے ساتھ زندگی میں بار بار نصیب ہو، آمین یارب العالمین۔

رمضان المبارک کے چند اہم پہلو

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۵ نومبر ۲۰۰۳ء)

شبِ قدر کا مہینہ

رمضان المبارک ایک بار پھر ہماری زندگی میں آیا ہے اور خاموشی کے ساتھ گزرتا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن کریم کا مہینہ فرمایا ہے کہ اس میں لوحِ محفوظ سے قرآن کریم اتارا گیا۔ اور جس رات یہ لوحِ محفوظ سے منتقل ہوا اُس رات کو اللہ تعالیٰ نے ''شبِ قدر'' قرار دے کر ایک ہزار مہینوں پر بھاری کر دیا۔ قرآن کریم نے اس ماہ میں مسلمانوں پر روزوں کا حکم صادر فرمایا اور کہا کہ روزے رکھنے سے تقوٰی پیدا ہوتا ہے اور روزہ رکھنے والوں میں پرہیزگاری کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صبر و ضبط کا مہینہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں دن کا روزہ اور رات کا قیام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اور اس مبارک مہینہ میں نیکیوں کا اجر بڑھ جاتا ہے۔

چاروں موسموں کا مہینہ

یہ چاند کا مہینہ ہے جو موسم بدلتا رہتا ہے، کبھی گرمیوں میں، کبھی بہار میں، کبھی برسات میں، اور کبھی سردیوں میں آتا ہے۔ رمضان المبارک تینتیس برسوں میں ہمارے موسموں کا چکر مکمل کرلیتا ہے۔ اور اس طرح ایک مسلمان بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر تک سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے کہ سال کا سب سے چھوٹا دن بھی اسے مل جاتا ہے اور سب سے بڑے دن کے روزے کا ثواب بھی وہ حاصل کرلیتا ہے، ہر ذوق کے لیے اس میں تسکین کا سامان فراہم ہوجاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے تین چیزیں زیادہ پسند ہیں:

1. گرمیوں میں روزے رکھنا،
2. مہمان کی خدمت کرنا،
3. تلوار لے کر دشمن کے خلاف جہاد کرنا۔

گرمیوں کے روزے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پسند ہیں۔ ایک واقعہ پڑھا تھا کہ پرانے زمانوں

میں ایک صاحب مکہ مکرمہ سے طائف کی طرف جا رہے تھے، پیدل سفر کا زمانہ تھا۔ مکہ مکرمہ گرم شہر ہے اور موسم گرما میں اس کی ریت کی تپش کا ایک عجیب رنگ ہوتا ہے، جبکہ طائف اس سے زیادہ دور نہیں ہے مگر ٹھنڈا ہے اور گرمی کے موسم میں ٹھنڈک کے متلاشیوں کا مرکز بنا رہتا ہے، جیسے ہمارے ہاں راولپنڈی گرم شہر ہے مگر اس سے تھوڑے فاصلے پر مری ٹھنڈا علاقہ ہے۔

وہ صاحب مکہ مکرمہ سے طائف جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک دوست ملا جو طائف سے مکہ مکرمہ کی طرف آ رہا تھا۔ ملاقات ہوئی، ایک دوسرے کا حال پوچھا اور دریافت کیا کہ کدھر جا رہے ہیں؟ ایک نے جواب دیا کہ رمضان المبارک قریب آ رہا ہے، مکہ مکرمہ گرم علاقہ ہے، اس لیے طائف جا رہا ہوں کہ ٹھنڈے علاقے میں روزے آرام سے رکھ لوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں بھی اسی لیے طائف سے مکہ مکرمہ جا رہا ہوں کہ طائف ٹھنڈا علاقہ ہے، روزے کا مزہ نہیں آئے گا، مکہ مکرمہ چلتا ہوں جہاں خوب گرمی ہوگی، پیاس لگے گی اور روزے کا مزہ آئے گا۔

آسان روزوں کیلئے اجتہاد کا تقاضہ

یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ نے رنگا رنگ کے ذوق اور مزاج عطا کیے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں جب جولائی اور اگست کے روزے تھے اور گرمی، پسینے اور پیاس نے روزوں کو خوب چمکا رکھا تھا، تو بعض حضرات کی طرف سے یہ تجویزیں سامنے آئیں کہ بھٹی پر کام کرنے والے مزدور اور کھیت میں محنت کرنے والے کسان کے لیے یہ روزے بہت مشکل ہیں، اس لیے علماء کرام کو ان کے لیے کوئی آسانی پیدا کرنی چاہیے اور اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔

یہ اجتہاد بھی ہمارے ہاتھ میں خوب ہتھیار ہے کہ جہاں کوئی مشکل محسوس ہوئی اجتہاد کے نام سے آسانیاں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ ایک صاحب نے اس زمانے میں ایک قومی اخبار کے ذریعے تجویز دی کہ اگر علماء کرام اجتہاد سے کام لے کر فروری کے مہینہ کو رمضان قرار دے دیں تو دو فائدے ہوں گے:

1. ایک یہ کہ روزوں کا موسم ہمیشہ کے لیے مناسب ہو جائے گا،
2. اور دوسرا یہ کہ یکم مارچ کو عید قرار دینے سے ہر سال دو یا تین عیدوں کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

مگر علماء کرام کے لیے ایسی تجویزوں پر کان دھرنا مشکل تھا کہ اجتہاد کی کچھ حدود ہیں، طریق کار ہے

اور شرائط ہیں جو صدیوں سے طے شدہ ہیں، ان کے دائرے میں رہنے والا عمل ہی اجتہاد کہلاتا ہے ورنہ الحاد بن جاتا ہے۔ اور اگر ان حدود اور شرائط کی پابندی کیے بغیر "آزاد اجتہاد" کا دروازہ کھل جائے تو دین کی شکل کچھ سے کچھ ہو جائے بلکہ اب تک کچھ سے کچھ ہو چکی ہوتی۔

نمازوں کی سہولت کیلئے اجتہاد کی فرمائش

چند سال قبل کی بات ہے کہ برطانیہ میں ٹرین کے سفر کے دوران ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کہا کہ مولوی صاحب! آپ اجتہاد کر سکتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ کیا میرے پاس اجتہاد کی کوئی اتھارٹی ہے؟ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا دِقت در پیش ہے؟ کہنے لگا کہ ملازم آدمی ہوں اور نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہوں لیکن ملازمت کے دوران مجھے ظہر اور عصر کے لیے چھٹی اور موقع نہیں ملتا، اس لیے میں اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ ظہر کی نماز فجر کے ساتھ پیشگی پڑھ لیا کروں اور عصر کی نماز مغرب کے ساتھ لیٹ ادا کر لیا کروں۔

میں نے سوچا کہ اب اس وقت اس نوجوان کو اجتہاد کا مطلب اور اس کی حدود سمجھانا آسان بات نہیں ہے اس لیے میں نے کہا کہ بھائی! میں ففٹی ففٹی معاملہ کر سکتا ہوں آپ کا سارا کام نہیں کر سکتا۔ یعنی آپ کو یہ اجازت دے سکتا ہوں کہ اگر دفتر یا کارخانے میں واقعی نماز کی گنجائش نہیں ملتی تو مجبوراً ظہر اور عصر دونوں نمازیں شام کو مغرب کے ساتھ پڑھ لیا کریں کہ قضا تو ہوگی مگر نماز ہو جائے گی۔ لیکن ظہر کی نماز فجر کے ساتھ پیشگی پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس طرح سرے سے نماز ہوگی ہی نہیں۔ اس لیے آپ ہر ممکن کوشش کریں کہ ظہر اور عصر کو اپنے وقت میں ہی کسی طرح پڑھ لیا کریں، لیکن اگر کسی صورت میں ممکن نہ ہو تو پیشگی پڑھنے کی بجائے بعد میں اگلی نماز کے ساتھ ادا کر لیں جو قضا کی صورت میں ادا ہو جائے گی۔

بنی اسرائیل کا رمضان

تفسیر مظہری میں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بعض روایات کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں بھی رمضان المبارک ہی کا مہینہ روزوں کے لیے مقرر تھا اور وہ بھی اسی طرح سال کے سارے موسموں میں گھومتا تھا۔ ایک دور میں انہیں بھی گرمیوں کے سخت روزوں نے تنگ کیا تو علماء سے درخواست کی گئی کہ وہ لچک پیدا کریں اور روزوں کے لیے مناسب موسم متعیّن کر دیں۔ بنی

اسرائیل کے علماء نے ایسا کر دیا اور موسم بہار کو روزوں کے لیے طے کر کے یہ اضافہ کیا کہ چونکہ ہم اپنی طرف سے شرعی معاملہ میں ردوبدل کر رہے ہیں اس لیے کفارے کے طور پر دس روزے زیادہ رکھا کریں گے، چنانچہ وہ اس طرح چالیس روزے رکھتے ہیں۔

سال بھر کی غفلت سے جگانے کا مہینہ

رمضان المبارک اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے اور قرآن کریم کا مہینہ ہونے کی وجہ سے اس کی مناسبت آج بھی قرآن کریم کے ساتھ زیادہ ہے۔ جس کا مظاہرہ عملی طور پر یوں ہوتا ہے کہ پورے سال کی بہ نسبت اس ماہِ مبارک میں قرآن کریم کی تلاوت اور پڑھنے کا معمول ہر جگہ بڑھ جاتا ہے۔ تراویح اور قیامِ لیل میں قرآن کریم کی قراءت کے ساتھ ساتھ عام معمولات میں قرآن کریم پڑھنے اور سننے کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ گویا سال بھر غفلت میں بسر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس ماہ میں قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کا جوڑ پھر سے تازہ کر دیتے ہیں اور بیٹریاں چارج ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام ہے جو قرآن کریم کے ساتھ عام مسلمان کا تعلق تازہ کرنے کے علاوہ خود قرآن کریم کی مسلسل حفاظت کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ اگر تراویح میں قرآن کریم سنانے کا معمول نہ ہو تو بہت سے حافظ حضرات قرآن کریم یاد نہ رکھ سکیں، تراویح میں قرآن کریم سنانے کی پابندی اس بات کا ذریعہ بن جاتی ہے کہ قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد قرآن کریم یاد رکھنے کا اہتمام کرتی ہے اور قرآن کریم انہیں مسلسل یاد رہتا ہے۔

نبی اکرمؐ کا رمضان ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی نظر میں

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان المبارک میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات میں روزوں کے علاوہ دو باتوں کا مزید اضافہ ہو جاتا تھا:

1. ایک یہ کہ قرآن کریم کی تلاوت و قراءت عام دنوں میں بھی جناب نبی اکرمؐ کا روزمرہ کا معمول ہوتا تھا، اور رات کی ایک تہائی وہ نوافل میں قرآن کریم پڑھتے تھے۔ لیکن رمضان المبارک میں اس کی مقدار بڑھ جاتی تھی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام روزانہ آکر آنحضرتؐ کے ساتھ اس وقت تک نازل شدہ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے۔
2. اس کے ساتھ رمضان المبارک میں جناب نبی کریمؐ کی سخاوت بھی بڑھ جایا کرتی تھی۔ عام

دنوں میں بھی معمول مبارک یہ تھا کہ کوئی سوالی آپؐ کے دَر سے خالی نہیں جاتا تھا، مگر رمضان المبارک میں تو آپؐ کی سخاوت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ جیسے موسم گرما میں ٹھنڈی ہوا چلا دی جائے۔

روزے کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر و ضبط کا ذریعہ بتایا ہے۔ اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ روزے کی حالت میں کھانے، پینے اور دیگر خواہشات پر کنٹرول رکھنے سے انسان میں یہ ذوق بیدار ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی اپنے نفس کو باز رکھے جو پورا سال اور دن رات ہر وقت کے لیے حرام ہیں۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تم متقی بن جاؤ اور تمہارے اندر پرہیزگاری پیدا ہو۔

امام غزالیؒ کے نزدیک روزے کے تین درجات

امام غزالیؒ نے روزے کے تین درجات بیان کیے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

1. ایک روزہ اس شخص کا ہے کہ اس نے روزے کی پابندی قبول کر کے کھانے پینے اور دیگر خواہشات پوری کرنے سے خود کو روکا ہوا ہے لیکن جسم کے باقی اعضا کا روزہ نہیں ہے۔ (یعنی) منہ، کان، آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ممنوعہ کاموں سے نہیں رک رہے اور ان پر روزے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ روزہ اصطلاحی روزہ ہے جس سے فریضہ تو اس شخص کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن روزے کا مقصد پورا نہیں ہوتا کہ روزہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔
2. دوسرا روزہ اس شخص کا ہے کس جس کا صرف منہ، پیٹ اور شرمگاہ کا روزہ نہیں بلکہ اس کے سارے اعضا روزہ کی حالت میں ہیں۔ اس نے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہے کہ زبان، کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ سے بھی گناہ کا کوئی کام سرزد نہ ہونے پائے۔ یہی روزہ شریعت کا مقصود ہے اور اسی طرح کے روزے سے قرآن کریم کی منشا کی تکمیل ہوتی ہے۔
3. جبکہ تیسرا روزہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کا ہے کہ وہ دل و دماغ کا بھی روزہ رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی فکر میں اس قدر مصروف و مشغول رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خیال دماغ میں نہ آنے پائے، اور اس کے سوا کوئی خواہش دل تک

رسائی حاصل نہ کر سکے۔ یہ روزہ مقربین کا روزہ ہے جو بہت خاص لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

رمضان المبارک گناہوں کی معافی کا مہینہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے رمضان المبارک کے دوران دن کے وقت ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ روزے رکھے، اور راتوں کو ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ تراویح اور تہجد و نوافل کی صورت میں قیام کیا، تو اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جبکہ گناہوں کی معافی اور توبہ کی قبولیت کی ایک علامت بعض بزرگوں نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر توبہ سے زندگی میں عملی تبدیلی آئی ہے تو یہ قبولیت کی نشانی ہے۔

خدا کرے کہ یہ رمضان المبارک ہمارے لیے حقیقی رحمتوں اور برکتوں کا باعث ہو، توبہ و استغفار کا ذریعہ بنے، زیادہ سے زیادہ اعمالِ صالحہ کے مواقع ہمیں اس میں فراہم ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ ہماری زندگیوں میں خوشگوار تبدیلی کا سبب بن جائے، آمین یارب العالمین۔

قرآن حکیم کے حقوق و آداب

(روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۷ نومبر ۲۰۰۳ء)

قرآن کریم کے لاکھوں حفاظ

رمضان المبارک گزرتا جارہا ہے اور دنیا بھر میں مسلمان اپنے اپنے ذوق اور توفیق کے مطابق اس کی برکتوں سے فیضیاب ہورہے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی لیے اس میں قرآن کریم سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور نماز کے بغیر بھی اس کی عام طور پر تلاوت ہوتی ہے۔ سمجھ کر پڑھنے والے بھی اس کے پڑھنے اور سننے کا حظ اٹھارہے ہیں، اور بغیر سمجھے پڑھنے سننے والے بھی اس کی برکات سے محروم نہیں ہیں۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ کسی اور کتاب کے حافظ موجود نہیں، مگر اس کے حافظوں کی تعداد دنیا میں اس وقت نوے لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، جنھوں نے قرآن کریم کو صرف یاد نہیں کیا بلکہ اسے یاد رکھنے کے لیے اس کو پڑھتے سنتے رہنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔

یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ جتنا اس کتاب کو باقاعدہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، دنیا کی کسی اور کتاب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔ سورج کی گردش کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی قراءت کے مناظر بھی زمین کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں اور شب و روز کا شاید ہی کوئی ایسا وقت ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اس کی تلاوت نہ ہورہی ہو۔

نسلِ انسانی کیلئے قرآن کریم کا بنیادی پیغام

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام اور خالقِ کائنات کا پیام ہے، جو ہر دور میں نسلِ انسانی کے لیے یہی رہا ہے کہ وہ اپنے مالک و خالق کو پہچانے، اور اس کے احکامات اور منشا کے مطابق زندگی بسر کرے۔ قرآن کریم کی بنیادی دعوت وہی ہے، جو جنت سے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے دی تھی:

"تمہارے پاس میری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی، جو ان ہدایات کی پیروی

کرے گا وہ خوف اور حزن سے نجات پائے گا، اور جس نے انکار اور تکذیب کا راستہ اختیار کیا وہ دوزخ کا ایندھن بنے گا۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر کا یہی پیغام رہا ہے کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے، اس کے پیغام کو سمجھے، اس کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھے کہ اس عارضی اور وقتی زندگی میں اس نے اس حوالے سے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس کی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی کا فیصلہ اسی کی بنیاد پر ہو گا۔ اسے قیامت کے روز دنیا میں کیے گئے اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا، اس حساب کتاب کے بعد اس کے جنت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو گا۔

قرآن کریم کا اصل موضوع

قرآن کریم کے بحرِ ناپیدا کنار سے غوطہ زنوں نے ہر قسم کے موتی حاصل کیے ہیں۔ چودہ سو برس سے مفسرین اور محققین ایک ایسے سمندر میں غوطہ زن ہیں جس کا کوئی کنارہ ہے نہ اس کی کوئی تہہ دکھائی دے رہی ہے۔ ہر غوطہ زن کو نئے موتی ملتے ہیں اور وہ نت نئے نکات سے دنیا کو روشناس کراتا ہے۔ مؤرخ کو تاریخی حقائق ملتے ہیں، سائنسدان کو کائنات کے نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ فلسفی کو راہرو فکر دوڑانے کے لیے نئے میدان میسر آتے ہیں، اور انسانی معاشرت کی ہیئت اور نفسیات کا ادراک حاصل کرنے والوں کو نئی حکمتوں اور باریکیوں کا فیض ملتا ہے، مگر قرآن کریم کا اصل موضوع بندے کو اس کے مالک وخالق سے جوڑنا اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کے دائرے میں لانا ہے۔ اور یہی تمام حکمتوں سے بڑی حکمت، تمام رازوں سے بڑا راز، اور تمام فلسفوں سے بڑا فلسفہ ہے۔

قرآن کریم اور غیر مسلم

قرآن کریم پوری نسل انسانی کے لیے ہے، مگر ہم مسلمانوں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور نسلِ انسانی تک اس کی رسائی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں میں سے اگر کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا کسی غیر مسلم کو قرآن کریم دینا جائز ہے؟ مغربی ممالک کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ سوال اکثر وہیں ہوتا ہے، ورنہ ساری دنیا کی صورتحال یہی ہے۔

قرآن کریم کے ادب واحترام کے حوالے سے یہ سوال درست بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

قرآن کریم کو طہارت والے لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، اور کافر عام طور پر طہارت کی حالت میں نہیں ہوتا اس لیے اس کے ہاتھ میں قرآن کریم دینا درست ہے یا نہیں ؟ مگر میرا ذہن دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بسا اوقات میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ جائز ہونے کی بات کر رہے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ غیر مسلموں تک قرآن کریم کو پہچانا ہمارے فرائض میں شامل ہے، دعوت کے نقطۂ نظر دیکھیں تو ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ ہم غیر مسلموں تک نہ صرف اسلام کی دعوت پہنچائیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیام بھی انہیں سنائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا پیغام قرآن کریم کے بغیر کیسے پہنچایا جا سکتا ہے ؟ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے:

> ”قرآن کریم تمہارے بارے میں گواہی دے گا۔ یہ گواہی تمہارے حق میں بھی ہو سکتی ہیں اور تمہارے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔“

گویا ایک مسلمان کے بارے میں قرآن کریم کی گواہی بہرحال ضروری ہے۔ طرز عمل صحیح ہو گا تو یہ گواہی حق میں ہو گی، اور رویہ درست نہ ہو گا تو گواہی خلاف ہو جائے گی۔ آج ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور اس کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بجا ہے، درست ہے اور برکات کا باعث ہے، لیکن اس پہلو پر بھی ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ کل قیامت کے روز ہمارے بارے میں اس کی گواہی کیا ہو گی ؟ اور اگر اس کی گواہی ہمارے خلاف ریکارڈ پر آگئی تو پھر کون سی دلیل ہمارے کام آئے گی اور کون سا عذر ہم اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کر سکیں گے ؟

قرآن کریم کے حقوق و آداب

قرآن کریم کے حقوق و اداب کی ایک لمبی فہرست مفسرین و فقہاء نے بیان کی ہے، لیکن ایمان و عقیدہ اور عقیدت و محبت کے بعد تین امور کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اور یہ قرآن کریم کے ایسے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اس مقدس کتاب پر ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا:

سمجھنے کا حق

پہلا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے، کیونکہ کسی بھی پیغام کا سب سے پہلا حق یہی ہوتا ہے۔ ہر پیغام کو اس کے بھیجنے والے اور پیغام لے کر آنے والے کی اہمیت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور پیغام وصول کرنے والا ہر شخص اپنی پہلی ذمہ داری یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس پیغام کو سمجھے اور اس کے مفہوم و مقصد سے آگاہ ہو، جو اس کے لیے آیا ہے۔ مگر ہم مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کا قرآن کریم کے

ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے، ہم قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی عقیدت و محبت ہمارے دلوں میں موجود ہے، اس پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں، مگر بدقسمتی سے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ یہ قرآن کریم کی حق تلفی ہے۔ اور تھوڑا گہرائی میں جا کر سوچیں تو قرآن کریم کو سمجھنے سے لاپرواہی، توہین اور بے ادبی کی حدود تک بھی جا پہنچتی ہے۔ ہمیں اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے حوالے سے ہمارا طرز عمل بہت عجیب ہے۔ یا تو سرے سے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کریں گے، اور اگر سمجھنے پر آجائیں گے تو پھر دوسری انتہا پر ہوں گے کہ اس کے فہم کا معیار بھی خود ہی بن بیٹھیں گے کہ ہم نے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب یہی سمجھا ہے۔ حالانکہ سادہ سی بات ہے کہ ملک کے قانون سے ناواقفیت کا مطلب کہیں بھی یہ نہیں ہوتا کہ قانون کی کتاب ہاتھ میں لے کر جس نے جو مطلب سمجھ لیا، وہی اس کے لیے دلیل بن گیا۔ بلکہ قانون سے واقفیت وہی معتبر ہوتی ہے جو قانون جاننے والوں کے ذریعے ہو۔ اسی طرح قرآن کریم کا فہم بھی اس کے ماہرین کی وساطت سے ہوگا تو صحیح ہوگا، ورنہ فکری انتشار کا سبب بنے گا۔ بہرحال یہ قرآن کریم کا پہلا حق ہے کہ اسے سمجھا جائے۔

عمل کرنے کا حق

اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کا دوسرا بڑا حق یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کا کوئی حکم سامنے آنے پر ایک مسلمان کو بریک لگ جائے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے اوصاف میں ان کے سوانح نگار اس بات کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں کہ ”وہ اللہ کی کتاب پر رُک جانے والے تھے“۔ یعنی قرآن کریم کا کوئی حکم سامنے آنے پر ان کے قدم یوں رک جاتے تھے جیسے سڑک پر سرخ بتی کا نشان دیکھ کر ایک اچھے ڈرائیور کا پاؤں خود بخود بریک پر ٹک جاتا ہے۔ قرآن کریم کے حوالے سے ایک مسلمان سے شریعت کا یہی سب سے بڑا تقاضا ہے کہ وہ قرآن کریم کو سمجھ کر اس کے احکام و قوانین پر عمل کرے اور اگر کوئی کام کرتے ہوئے قرآن کریم کا حکم اس کے خلاف اس کے علم میں آجائے تو فوراً اسٹاپ ہو جائے اور اس کے قدم بے ساختہ رک جائیں۔

دوسروں تک پہنچانے کا حق

اس کے بعد قرآن کریم کا تیسرا بڑا حق مسلمانوں کے ذمہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے پیغام اور

تعلیمات کو نسلِ انسانی کے ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ہمارے دینی فرائض میں بھی شامل ہے۔ اور اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بات بہت سنگین ہو جاتی ہے کہ ہماری غفلت سے جن لوگوں تک اسلام کی دعوت اور قرآن کریم کا پیغام نہیں پہنچ پاتا، ان کے کفر اور گمراہی کے ذمہ داری میں ہم بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

رمضان المبارک کا آخری عشرہ قریب آرہا ہے، اس میں قرآن کریم کی طرف ہماری رغبت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بڑھنی بھی چاہیے کہ نزولِ قرآن کی رات ''لیلۃ القدر'' اسی عشرہ میں ہے۔ لیکن قرآن کریم کی قراءت، اس کے سماع، قرآن کریم کی محافل، شبینوں، نوافل اور دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم سب کو اس پہلو پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ قرآن کریم کے حقوق کے حوالے سے ہماری صورتحال کیا ہے؟ اور اگر کل قیامت کے روز قرآن کریم نے بارگاہِ ایزدی میں ہمارے خلاف ''حق تلفی'' کا استغاثہ کر دیا تو کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کے حقوق کو سمجھنے اور انہیں ادا کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم اور رمضان المبارک کی برکات

(روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۹اکتوبر ۲۰۰۶ء)

اس سال رمضان المبارک کے آخری عشرے کے دوران مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور دیگر درجنوں دینی مراکز میں تراویح میں ختمِ قرآن کریم کے حوالے سے منعقد ہونے والی تقریبات میں گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

زمین کی گردش اور تلاوتِ قرآن کریم

رمضان المبارک کا تعارف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قرآن ہی کے حوالے سے کرایا ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا۔ اس لیے قرآن کریم اور رمضان المبارک آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ اور ان کا یہ جوڑ اس قدر مضبوط ہے کہ نہ صرف یہ کہ رمضان المبارک میں قرآن کریم اتارا گیا بلکہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی یہ مقدس کتاب پڑھی بھی سب سے زیادہ جاتی ہے۔ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں قرآن کریم اتنا پڑھا اور سنا نہیں جاتا جتنا اس ماہِ مبارک میں پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ آپ تراویح کے حوالے سے دیکھ لیں کہ تراویح میں روزانہ بیک وقت کتنی جگہوں پر قرآن کریم پڑھا اور سنا جاتا ہے؟ اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ تراویح کا وقت ساری دنیا میں ایک نہیں ہے:

- ہم جب سحری کھا رہے ہوتے ہیں، اس وقت بھی دنیا میں کسی جگہ تراویح کا وقت ہوتا ہے،
- جب ہم صبح آرام سے فارغ ہو کر دفتر، دکان اور کام پر جا رہے ہوتے ہیں تب بھی کہیں تراویح ہو رہی ہوتی ہیں،
- اور جس وقت ہم روزہ افطار کرتے ہیں، اس وقت بھی دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ہزاروں مسلمان تراویح پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

گویا رمضان المبارک کے دوران شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں تراویح ادا نہ کی جا رہی ہوں، اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نماز کی حالت میں کھڑے قرآن کریم نہ سن رہے ہوں۔ یہ قرآن کریم کا وہ اعجاز ہے جس کا ہم کھلی آنکھوں سے آج کے دور میں مشاہدہ کر

رہے ہیں، بلکہ خود بھی اس میں شریک اور حصہ دار ہیں۔

حفاظ کرام، دنیا کے ہر خطہ میں

ہمارا موجودہ دور تنزل کا دور ہے، ادبار کا دور ہے اور انحطاط کا دور ہے، لیکن معروضی صورتحال یہ ہے کہ زندگی کے باقی تمام شعبوں میں ہم سمٹ رہے ہیں، سکڑ رہے ہیں اور سہمے ہوئے ہیں، مگر قرآن کریم کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور اس کی وسعتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں قرآن کریم کے مدارس نہ ہوں، ہزاروں بچے جس میں حافظ قرآن نہ بن رہے ہوں، اور مختلف عنوانات سے قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا عمل جاری نہ ہو۔

میں اس سلسلہ میں اپنے ایک ذاتی مشاہدے اور تاثر کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ گزشتہ سال رمضان المبارک کا ابتدائی عشرہ میں نے امریکہ میں گزارا اور پہلی شب کی تراویح بالٹیمور کی مسجد رحمت میں پڑھیں۔ پاکستان ہی سے تعلق رکھنے والے ایک قاری صاحب نے، جو میرے ہمنام ہیں، ڈیڑھ پارہ پڑھا، سینکڑوں مرد اور ان کے ساتھ سینکڑوں عورتیں ملحقہ ہال میں نماز تراویح ادا کر رہی تھیں۔

میں قاری زاہد صاحب کی اقتدا میں تراویح پڑھ رہا تھا کہ میرا ذہن اچانک اس سوال کی طرف گھوم گیا کہ امریکہ میں اس وقت نماز تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حفاظ و قراء کی تعداد کیا ہو گی؟ میں چونکہ امریکہ بہت مرتبہ گیا ہوں اور اس کے متعدّد شہروں میں گھوما پھرا ہوں، اس لیے اپنے اندازے سے سوال کا جواب یہ سوچا کہ امریکہ کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظوں اور قاریوں کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہو گی۔

دیگر مذہبی کتابوں کے حفاظ؟

اس کے ساتھ ہی دوسرا سوال ذہن میں آ گیا کہ امریکہ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ایک فیصد اور دو فیصد کے درمیان بتایا جاتا ہے، جبکہ عیسائیوں کی آبادی پچانوے فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہو گی۔ اور امریکہ کے عیسائی یورپ کے عیسائیوں کی طرح لامذہب نہیں ہیں بلکہ مذہب اور اس کی عبادات و اقدار کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں، لیکن کیا پچانوے فیصد آبادی رکھنے والے مسیحیوں کو ڈیڑھ فیصد آبادی رکھنے والے مسلمانوں کے ہزاروں حفاظ قرآن کریم کے مقابلے میں اپنی مذہبی کتاب کا ایک بھی ایسا حافظ مل جائے گا جو اسی طرح آگے کھڑا ہو کر بائبل کی کوئی کتاب زبانی پڑھ دے، جس طرح روانی

اور تسلسل کے ساتھ حفاظ قرآن کریم سناتے ہیں؟ کافی سوچ و بچار کے بعد بھی مجھے اس سوال کا جواب اثبات میں نہ ملا۔

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا وہ سدا بہار پہلو ہے جس کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اور یہ پہلو ایسا ہے جس کے ساتھ مسلمان کا تعلق آج بھی قائم ہے، بلکہ یہ عرض کیا جائے تو مناسب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ایک بار پھر تازہ کر دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر رمضان المبارک میں تراویح اور قیام اللیل کا یہ مربوط نظام نہ ہوتا، اور ہر طرف قرآن کی قراءت اور سماع کی گہما گہمی نہ ہوتی، تو کیا ہمارا قرآن کریم کے ساتھ یہ جوڑ باقی رہتا جو آج سب کو نظر آ رہا اور دنیا بھر اسلام دشمن قوتوں کے لیے اضطراب اور بے چینی کا باعث بنا ہوا ہے؟ بلکہ قرآن کریم کے حفاظ اور قراء کرام، جو یقیناً دنیا میں ایک کروڑ کے لگ بھگ ضرور ہوں گے، کیا تراویح، شبینہ اور قیام اللیل کے اس سسٹم کے بغیر قرآن کریم حفظ کر لینے کے بعد اسے زندگی بھر یاد رکھنے میں کامیاب ہو پاتے؟

رمضان المبارک، قرآن کریم سے تعلق قائم رکھنے کا ذریعہ

رمضان المبارک کی برکات میں سے صرف اس ایک برکت کی وسعت اور تنوع پر غور کر لیا جائے تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ قائم ہے اور ہر سال اس کی تجدید ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس صورتحال کی یہ تعبیر بھی نامناسب نہیں ہو گی کہ ہماری سال بھر کی غفلتوں، بے پروائیوں اور کوتاہیوں کے بعد اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں ہمیں پھر سے قرآن کریم کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور ہماری بیٹریاں اپنی اپنی گنجائش کے مطابق چارج ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کے ساتھ ہم جس قدر عقیدت کا اظہار کریں کم ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے لیے ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ تو ہے ہی، ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا بھی سب بڑا ذریعہ ہے۔

قرآن کریم ہمیں کس نظر سے دیکھتا ہے؟

لیکن میں اس سے ہٹ کر ایک اور پہلو سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم تو قرآن کریم کے بارے میں بہت کچھ کہتے ہیں اور مختلف حوالوں سے اپنے تعلق اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ خود قرآن کریم ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے اور وہ ہمیں کس نظر سے دیکھتا ہے؟

اس سلسلہ میں سورۃ الفاطر کی آیت نمبر ۳۲ آپ کے سامنے تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں فرمائی ہیں:

- ایک یہ کہ جن لوگوں کو ہم نے قرآن کریم کا وارث بنایا ہے ان کا انتخاب ہم نے خود کیا ہے،
- اور دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کے وارث ہیں وہ تینوں درجوں پر ہیں۔ ایک طبقہ ان میں ظالم ہے، دوسرا مقتصد ہے، اور تیسرا سابق بالخیرات ہے۔

قرآن کریم کے وارث کون ہیں؟ اس سلسلہ میں مفسرین کرام دو باتیں فرماتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے درجے میں درست ہیں:

1. ایک یہ کہ پوری امت بحیثیت امت قرآن کریم کی وارث ہے، اور اس میں شبہ کی کوئی بات نہیں کہ اقوامِ عالم کے تناظر میں دیکھا جائے تو امتِ محمدیہ ہی قرآن کریم کی وارث کہلائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم کے وارث وہ لوگ ہیں جن کا قرآن کریم کے ساتھ کوئی نہ کوئی عملی تعلق ہے، پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں، اس کی تنفیذ کرتے ہیں اور کسی بھی حوالے سے اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کی خدمت کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ وارث ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا انتخاب میں نے خود کیا ہے۔ امتی ہونے کے حوالے سے دیکھ لیجئے کہ ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اور اس وجہ سے قرآن کریم کے وارثوں میں شامل ہیں، لیکن امتی ہونے میں ہماری کسی خواہش اور چوائس کا دخل نہیں ہے، یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانوں میں پیدا کیا اور ہم جناب نبی اکرمؐ کی امت میں شمار ہو گئے ہیں، ورنہ وہ ہمیں کسی سکھ، ہندو، عیسائی یا مجوسی کے گھرانے میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔
2. دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ قرآن کریم کے وارث تین حصوں میں تقسیم ہیں: ایک حصے کو ظالم کہا گیا ہے، دوسرے کو مقتصد کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، اور تیسرے حصے کو سابق بالخیرات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان تینوں تعبیرات سے کیا مراد ہے؟ اس پر مفسرین کرامؒ نے بہت سے نکات بیان فرمائے ہیں، جن میں سے امام فخر الدین رازیؒ کے بیان کردہ دو تین تفسیری نکات کا ذکر کروں گا جو انہوں نے ''تفسیر کبیر'' میں ذکر فرمائے ہیں:

- ظالم سے مراد وہ ہیں جو قرآن کریم نہیں پڑھتے، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے تو

ہیں عمل نہیں کرتے، اور سابق سے مراد وہ لوگ ہیں جو پڑھتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔

- ظالم سے مراد وہ ہیں جو قرآن کریم کے پڑھنے اور سمجھنے سے بے پرواہیں، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اور سابق وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کا علم اور فہم رکھتے ہیں۔
- ظالم سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں، جبکہ سابق سے مراد وہ لوگ ہیں جو خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔
- ظالم سے مراد وہ ہیں کہ جن کے روزمرہ معمولات میں گناہ غالب ہوتے ہیں، مقتصد سے مراد وہ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ یکساں اور برابر رہتے ہیں، جبکہ سابق سے مراد وہ حضرات ہیں جن کی زندگی کے اعمال میں نیکیاں گناہوں پر غالب ہوتی ہیں۔

یہ ساری تعبیرات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، صرف اظہار کے پہلوؤں کا فرق ہے ورنہ سب کا نتیجہ اور ثمر ایک ہی ہے۔ اور میں اس آیت کریمہ کے حوالے سے اپنے آپ کو، آپ سب حضرات کو اس بات پر غور و فکر کی دعوت دینا چاہوں گا کہ یہ وہ درجہ بندی ہے جو خود قرآن کریم نے ہمارے بارے میں کی ہے اور ہمیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، جس کو دیکھ کر ہم میں سے ہر شخص کو اپنے بارے میں جائزہ لینا چاہیے کہ اس کا شمار کس درجے میں ہوتا ہے اور وہ کس کیٹیگری میں شامل ہے؟

قرآن کریم کے ساتھ تعلق کے بارے میں اس پہلو پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رمضان المبارک اب ہم سے رخصت ہو چکا ہے، اس دوران قرآن کریم کی تلاوت و سماع اور نیکی کے دیگر مختلف اعمال کے ساتھ ہمارے تعلق میں جو تجدید اور تازگی آئی ہے اسے صرف اس ماہ تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ رمضان المبارک کے بعد بھی اس کا تسلسل قائم رہے۔

رمضان المبارک میں نبی اکرم ﷺ کا معمول

(۳ ستمبر ۲۰۰۷ء کو دارالہدیٰ، اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں خطاب سے ماخوذ)

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب رمضان المباک کا آخری عشرہ آتا تھا تو أحيى ليله وشد مئزره و أيقظ أهله۔ کمر باندھنا ایک محاورہ ہے۔

یعنی حضورؐ رمضان کے آخری عشرے میں نماز، روزہ اور عبادات کے لیے کمر کس لیتے تھے۔

دوسرا یہ کہ آپ رات کو زندہ کرتے تھے یعنی عام دنوں میں آپؐ رات کا تیسرا حصہ عبادت کرتے تھے، جبکہ رمضان میں ساری رات عبادت فرمایا کرتے تھے۔

تیسرا جملہ یہ ہے کہ اکیلے نہیں بلکہ گھر والوں کو بھی عبادت کے لیے بیدار کیا کرتے تھے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ حضورؐ گھر والوں کو ترغیب بھی دیتے تھے اور اس پر کچھ سختی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رمضان کی ایک رات میں حضورؐ عبادت کر رہے تھے کہ اچانک فرمایا دیکھو اللہ کی کتنی انوار و برکات نازل ہو رہی ہیں، کوئی جا کر اِن حجرے والیوں کو بھی جگائے کہ اللہ کی بندیو! اللہ کی رحمتیں بانٹی جا رہی ہیں، اٹھو اور اللہ کی ان رحمتوں اور برکتوں سے اپنا حصہ وصول کرو۔

قرآنِ کریم اور حضرت عمرؓ کا ذوق

(۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ (۲۰۰۷ء) کو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں
ختمِ قرآن کریم کے موقع پر خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس ماہ میں قرآن کریم نازل ہوا اور اسی میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت و سماع اور دیگر اعمالِ خیر کی توفیق زیادہ دیتے ہیں، مواقع زیادہ مہیا فرماتے ہیں اور اجر و ثواب بھی کئی گنا زیادہ دیتے ہیں۔ تراویح میں قرآن کریم سنانے اور اور سننے کی اس سعادت پر برادر عزیز مولانا محمد عرباض خان سواتی سلّمہٗ اور جامع مسجد نور کے نمازیوں کو مبارکباد دیتے ہوئے اس مناسبت سے قرآن کریم کے حوالے سے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک مکتوب گرامی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے بصرہ کے عامل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا جس سے قرآن کریم کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور رہنمائی اور سبق حاصل ہوتا ہے۔

کتاب اللہ کی فوقیت اور اہلِ علم کی قدر

حضرت امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں قرآن کریم کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذوق کی دو باتوں کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے:

1. ایک یہ کہ کان وقافا عند کتاب اللہ قرآن کریم کا حوالہ سامنے آنے پر وہ رک جایا کرتے تھے، یعنی قرآن کریم کا کوئی حکم سامنے آتا تو تھوڑی دیر رک کر اور توقف کر کے اس بات کا جائزہ لیتے تھے کہ قرآن کریم کا حکم کیا ہے اور اس کے بارے میں میرا عمل اور رویہ کیا ہے؟
2. جبکہ دوسری بات امام بخاریؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مجلسِ شوریٰ میں قرآن کریم کا علم رکھنے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، خواہ وہ بزرگ ہوں یا نوجوان۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ان کی مشاورت کے حلقہ میں بڑے بڑے بزرگوں کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حر بن قیسؓ جیسے نوجوان صحابہ بھی شامل تھے اور انہیں مشاورت میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

حفاظ کرام کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ایک مکتوب

طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں اسلامی سلطنت کے صوبائی عمّال کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں قرآن کریم کے حافظوں کی فہرست مرتب کر کے انہیں بھجوائیں تاکہ وہ ان کا بیت المال سے وظیفہ جاری کریں اور مختلف علاقوں میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے ان کا تقرر کریں۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے ہر شخص کے لیے اڑھائی ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ درہم چاندی کا سکہ تھا جس کا وزن ساڑھے تین ماشے بتایا جاتا ہے، اگر بازار میں چاندی کی قیمت تین سو روپے فی تولہ ہو تو آج کی کرنسی میں اس درہم کی قیمت پچھتر یا اسی روپے بنتی ہے جو امریکی ڈالر سے زیادہ ہے اور یورپی یونین کے یورو کے لگ بھگ ہے، سرسری اندازے میں پاکستانی کرنسی کے حساب سے یہ وظیفہ کم و بیش دو لاکھ روپے سالانہ بنتا ہے۔

یہ عالمِ اسلام میں حفاظ قرآن کریم کی تعداد کے بارے میں پہلا سروے تھا جس میں حافظوں کا شمار کیا گیا اور ان کی فہرستیں مرتب کی گئیں۔ جبکہ مجھے امریکہ کے حالیہ کے سفر کے دوران مکی مسجد بروکلین نیویارک میں خطاب کے موقع پر اسلامک سوسائٹی نارتھ آف امریکہ (ISNA) کی ویب سائٹ کے حوالے سے بتایا گیا کہ تازہ ترین سروے کے مطابق دنیا میں اس وقت قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد تیرہ ملین یعنی ایک کروڑ تیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، جو بلاشبہ آج کے دور میں، جو ہم مسلمانوں کے زوال اور ادبار کا دور ہے، قرآن کریم کے اعجاز کا کھلا اظہار ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور بے نیازی ہے کہ ہم مسلمانوں کا حال دن بدن پتلا ہوتا جا رہا ہے اور ہمارا ہر آنے والا دن گزرنے والے دن سے بدتر ہوتا ہے، لیکن اس دور میں قرآن کریم کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے جو قرآن کریم کی حقانیت اور اعجاز کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے مکتوب گرامی کے جواب میں بصرہ کے عامل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے انہیں بصرہ کے حفاظ کی فہرست بھجوائی جو تین سو حفاظ پر مشتمل تھی۔ اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور بصرہ کے حافظ قرآن مسلمانوں کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جو دوسری بہت سی کتابوں کے علاوہ کنز الاعمال (ج ۱، ص ۲۱۷) میں بھی مذکور ہے اور اس کا ترجمہ و مفہوم یہ ہے:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اللہ کے بندے عمر بن الخطابؓ کی طرف سے
عبداللہ بن قیسؓ (ابو موسیٰ اشعری) اور حفاظ قرآن کے نام۔
السلام علیکم۔

- واضح ہو کہ یہ قرآن کریم تمہارے لیے باعثِ اجر و ثواب ہونے والا ہے، لہٰذا اس کی تعلیم پر عمل کرو اور اسے اپنے مقاصد کا آلۂ کار نہ بناؤ۔
- جو قرآن کریم کو اپنا قائد و متبوع بنائے گا، قرآن کریم اسے جنت کی سیر کرائے گا۔
- قرآن کریم کو خدا کے حضور تمہارا سفارشی ہونا چاہئے، نہ کہ تمہارے خلاف شکایت کرنے والا، کیونکہ قرآن جس کا سفارشی ہو گا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے خلاف شکایت کرے گا وہ دوزخ میں جلے گا۔
- جب خدا کا بندہ رات میں اٹھتا ہے اور مسواک کر کے وضو کرتا ہے، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھتا ہے، تو فرشتہ اس کا منہ چومتا ہے اور کہتا ہے کہ پڑھو پڑھو، تم پاک و صاف ہو گئے، قرآن کریم پڑھ کر تمہیں لطف آئے گا۔
- قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ، علم کا پھول اور رحمٰن کا تازہ کلام ہے۔
- اگر رات میں اٹھنے والا بغیر مسواک کے وضو کرتا ہے تو فرشتہ اس کی نگرانی تو کرتا ہے لیکن منہ نہیں چومتا۔
- نماز میں قرآن پڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھپا ہوا خزانہ مل جائے اور مخفی دولت حاصل ہو جائے۔
- قرآن کریم پڑھا کرو، نماز نور ہے، زکوٰۃ برہان ہے، صبر روشنی ہے، روزہ ڈھال ہے، اور قرآن تمہارے بارے میں ایک دلیل ہے۔
- قرآن کریم کا احترام کرو اور اس سے بے اعتنائی نہ برتو، کیونکہ خدا اس کی عزت کرتا ہے جو قرآن کریم کی عزت کرتا ہے، اور اس کو بے آبرو کر دیتا ہے جو قرآن کریم کی بے حرمتی کرتا ہے۔
- جو شخص قرآن کریم پڑھے، اس کو یاد کرے، اور پھر اس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے، دعا کرنے والا چاہے تو خدا دنیا میں اس کی دعا کو پورا کر دیتا ہے ورنہ اس کی

مانگی ہوئی چیز آخرت کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔

- یاد رکھو خدا کا انعام بہترین اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو صاحبِ ایمان ہیں اور اپنے مالک پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

یہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے مکتوب گرامی کا خلاصہ ہے جس میں انہوں نے قرآن کریم کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی تلقین کی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دو امریکی پولیس افسروں کا قبولِ اسلام

اس کے ساتھ ہی اپنے حالیہ سفر امریکہ کے حوالے سے اور ایک بات کی آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رمضان المبارک سے چند روز قبل نیویارک اسٹیٹ پولیس کے دو بڑے افسروں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، اور جب ان سے ایک پریس کانفرنس میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے اور اسے نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لیے سب سے بہتر کتاب پایا ہے اور اس سے متاثر ہو کر وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ خبر جب میں نے پڑھی تو ذہن میں ایک سوال ابھرا جسے آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان دو پولیس افسروں نے قرآن کریم کو ایک رہنما کتاب کے طور پر پڑھا اور انہیں رہنمائی مل گئی، مگر ہم ابھی تک قرآن کریم کو تبرک اور تعوّذ کی کتاب سمجھے ہوئے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے اجر و ثواب کے ساتھ ساتھ کاروبار میں برکت حاصل ہوگی اور گھر کے ماحول سے شیطانی اثرات دور ہوں گے۔ مجھے ان تینوں میں سے کسی بات سے بھی انکار نہیں ہے لیکن قرآن کریم کا اصل عنوان ھدی للناس اور ھدی للمتقین ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جس دن ہم مسلمانوں نے بحیثیت امت قرآن کریم کو ہدایت اور رہنمائی کے لیے رہنما کتاب کے طور پر پڑھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تو ہمارے سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

روزہ کا تاریخی پس منظر اور رمضان المبارک کی فضیلت

(ستمبر ۲۰۰۸ء کے دوران مدینۃ العلوم، اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے رمضان المبارک اور اس کے ساتھ روزے کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بات بتائی ہے کہ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں اور بھوکا پیاسا رہنا تمہارے لیے عبادت قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی امتوں پر روزے فرض کیے گئے تھے۔ اور جب سے یہ مذہب اور انسان چلے آرہے ہیں نماز، روزہ اور دیگر عبادات بھی چلی آرہی ہیں۔ یعنی تم سے پہلے لوگ بھی روزے رکھتے تھے اور ان پر بھی روزے ایسے ہی فرض تھے جیسے تم پر فرض کیے گئے ہیں۔ البتہ روزے کا جو طریقہ و نظم پہلی امتوں میں تھا، اسلام نے اس میں کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں کیں۔ میں اس وقت دو بڑی تبدیلیوں کا ذکر کروں گا۔

روزہ کے دورانیہ میں کمی

ایک تبدیلی تو یہ کی کہ روزے کا دورانیہ کم کر دیا۔ پہلی امتوں میں آٹھ پہر کا روزہ ہوتا تھا، رات کو سونے سے پہلے کھانے پینے کی اجازت تھی لیکن رات کو جونہی سو گئے تو روزہ شروع ہو گیا، پھر دوسرے دن سورج کے غروب ہونے تک روزہ چلتا تھا۔ ہماری اصطلاح میں اسے آٹھ پہر کا روزہ کہتے ہیں۔ پہلی امتوں میں یہی تھا۔ ہم مسلمانوں کے لیے بھی آغاز میں روزے کا یہی دورانیہ تھا۔ ابتدا میں جب روزے فرض ہوئے تو آٹھ پہر کا روزہ ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہؐ کو یہ سہولت عطا فرمائی کہ رات کو روزے سے نکال دیا۔

اس پر محدثین نے ایک کاشتکار انصاری صحابیؓ کا واقعہ نقل کیا ہے جنہوں نے پرانے طریقہ کے مطابق آٹھ پہر کا روزہ رکھا ہوا تھا، دن بھر کاشتکاری کر کے شام کو گھر آئے اور نماز وغیرہ پڑھ کر فارغ

ہوئے کہ اب کھانا کھاتا ہوں، گھر والوں سے کھانے کے متعلق دریافت کیا، گھر والوں نے کہا آپ بیٹھیں ہم تیار کرتے ہیں۔ جونہی کھانے کے انتظار میں یہ صحابیؓ بیٹھے تو ان کی آنکھ لگ گئی اور سو گئے۔ جیسے ہی سوئے اگلا روزہ شروع ہو گیا۔ آٹھ پہر کا روزہ تو پہلے ہی تھا، اور اب آٹھ پہر کا اگلا روزہ شروع ہو گیا۔ دوسرے دن وہ لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ ایک محنت کش آدمی اور دو دن کی بھوک۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا کیا ہوا بھئی؟ صحابیؓ نے بتایا کہ یا رسول اللہ میرے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت یہ گنجائش بلکہ حکم نازل ہوا کہ رات روزے سے خارج ہوگی اور روزے کا آغاز طلوعِ فجر سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ کھاؤ پیو جب تک کہ صبح کے وقت سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے، پھر روزوں کو رات تک پورا کرو۔ یہ اجازت دی گئی کہ اس وقت تک کھا پی سکتے ہو جب تک پو نہ پھٹ جائے یعنی طلوعِ فجر نہ ہو جائے۔ جب فجر طلوع ہو رہی ہو تو آسمان کے افق پر مشرق کی جانب دو لکیریں دکھائی دیتی ہیں، ایک صبح کی روشنی کی سفید لکیر اور دوسری رات کی تاریکی کی سیاہ لکیر۔ یہ جو دو لکیریں آسمان پر الگ الگ نظر آتی ہیں، اسے پو پھٹنا کہتے ہیں، اور یہی دراصل طلوعِ فجر کا وقت ہے۔

چنانچہ ایک اصلاح اسلام نے روزے کے نظام میں یہ کی کہ روزے کا دورانیہ کم کر دیا اور طلوع فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک روزے کا دورانیہ مقرر کر دیا۔ سحری کی صرف اجازت نہیں دی گئی بلکہ سحری کو سنت قرار دیا گیا۔ سحری کھانا جناب نبی کریمؐ کا معمول مبارک تھا۔ اس طرح روزے کو سنت کے مطابق بنانے کے لیے سحری کھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

فرض روزوں کیلئے رمضان المبارک کی تخصیص

اسلام نے روزے کے نظام میں دوسری اصلاح یہ کی کہ فرض روزوں کو رمضان المبارک میں مخصوص کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق پہلی امتوں میں بھی رمضان ہی کے روزے تھے لیکن انہوں نے اپنی سہولت کی خاطر روزوں کے ایام اور موسم میں تبدیلی کر لی تھی۔ جیسا کہ مسیحیوں میں مارچ کے روزے رکھے جاتے ہیں اور اپریل کے آغاز میں عید الفطر "ایسٹر" کے عنوان سے منائی جاتی ہے۔ اسلام نے وہ تبدیلی ختم کر کے سابقہ صورت یعنی رمضان کے روزے بحال کر دیے۔ تفسیر مظہری میں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے روایات نقل کی ہیں کہ پہلی امتوں میں بھی فرض روزے

رمضان کے مہینے میں ہی ہوتے تھے۔

چانداور سورج کی گردش سے ایام اور اوقات کا تعین

دنیا میں وقت اور دن کا نظام سورج کی گردش کے حساب سے چلتا ہے، جبکہ ایام کے تعین کا نظام چاند کی گردش کے حساب سے ہوتا ہے۔ سورج کی گردش والا سال شمسی سال کہلاتا ہے اور جنوری، فروری، مارچ، اپریل وغیرہ کے مہینے شمسی سال کے مہینے ہیں۔ جبکہ چاند کی گردش والا سال قمری سال کہلاتا ہے اور محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی وغیرہ قمری سال کے مہینے ہیں۔ اسلامی کیلنڈر اس لحاظ سے قمری ہے کہ اسلام میں دِنوں اور مہینوں کا حساب چاند کے لحاظ سے ہے۔ مگر اسلامی عبادات کا نظام دونوں گردشوں سے متعلق ہے، سورج سے بھی اور چاند سے بھی۔ ہماری عبادات اور شرعی معاملات میں سورج کی گردش کا اعتبار بھی ہے اور چاند کی گردش کا اعتبار بھی ہے۔

- اسلامی شریعت میں ایام کا تعین چاند سے ہوتا ہے۔ ہم جب ایام اور مہینے طے کرتے ہیں تو چاند کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ شبِ برات، شبِ معراج، شبِ قدر، ایامِ بیض، یومِ عاشورہ اور ایامِ حج وغیرہ قمری مہینوں کے اعتبار سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح روزے کے دنوں کا تعین کہ یہ پہلا روزہ ہے، یہ اکیسواں ہے، یہ ستائیسواں ہے، یہ انتیسواں ہے وغیرہ، یہ رمضان کے مہینے کے اعتبار سے ہیں جو کہ چاند کا مہینہ ہے۔ اسی طرح حج کے ایام کا تعین بھی چاند کے مہینے یعنی ذی الحج کے حساب سے طے ہوتے ہیں کہ آج یوم الترویہ ہے، آج یوم الحج ہے اور آج یوم الاضحیٰ ہے وغیر ذٰلک۔
- لیکن ہم جب اوقات طے کرتے ہیں تو ان میں سورج کا اعتبار ہوتا ہے۔ ہم نمازوں کے اوقات سورج کی گردش سے طے کرتے ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور دیگر نفلی نمازوں کے اوقات کا تعلق سورج کی گردش سے ہوتا ہے۔ سورج کی گردش کا دورانیہ بڑھ جائے تو نمازوں میں وقفہ زیادہ ہوجاتا ہے، اور سورج کی گردش کا دورانیہ کم ہوجائے تو نمازوں کے درمیان وقفہ کم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ہماری روزمرہ نمازیں سورج کے اعتبار سے ہیں۔ اسی طرح رمضان یا غیر رمضان کے روزوں کا دورانیہ بھی سورج کے حساب سے ہی ہے۔ طلوعِ فجر سے روزے کا آغاز ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب پر روزے کا اختتام ہوتا ہے۔ ایسے ہی حَج کے اعمال میں بھی اوقات کا تعلق سورج سے ہے کہ رمی کس وقت کرنی ہے، مزدلفہ کب جانا

ہے، عرفات سے کب آنا ہے وغیرہ۔

عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ اسلام میں صرف چاند کا اعتبار ہے، ایسی بات نہیں ہے۔ چاند کا اعتبار دِنوں کے تعین میں ہے لیکن عبادات کے اوقات میں ہم روزمرہ سورج کی گردش کے مطابق چلتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں عبادات میں چاند اور سورج دونوں کا یکساں اعتبار ہے۔ البتہ چاند کا سال سورج کے سال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ تقریباً دس دن کا فرق ہے۔ مفسرین اس میں بہت سی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔

ایک حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ چاند کا مہینہ ہر تینتیس میں چکر مکمل کرلیتا ہے۔ یعنی تینتیس سال میں چاند چاروں موسموں (دنیا میں جہاں جہاں چار موسم ہوتے ہیں) میں گردش پوری کرلیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کو بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر کو پہنچنے تک تیس پینتیس سال مل جائیں تو وہ سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے۔ اسے ٹھنڈے روزے بھی مل جاتے ہیں اور گرم بھی۔ چھوٹے، درمیانے اور لمبے روزے سبھی مل جاتے ہیں۔ حج کا بھی یہی معاملہ ہے، حج بھی تینتیس سال میں موسموں کی گردش پوری کرتا ہے۔ یہاں ضمناً ایک بات قابل ذکر ہے۔ فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حساب قمری سال کے اعتبار سے کرنا چاہیے اور ایسا کرنا شرعاً ضروری ہے۔ ورنہ اگر ہم شمسی سال کے اعتبار زکوٰۃ کا حساب کریں گے تو تینتیس سال میں ایک سال کی زکوٰۃ کم ادا ہوگی۔ جیسا کہ ہمارے زندگی کے عام حسابات شمسی مہینوں یعنی جنوری اور فروری وغیرہ کے حساب سے چلتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی سالانہ زکوٰۃ بھی اسی حساب سے دیتا ہے تو تینتیس شمسی سالوں میں چونتیس قمری سال گزریں گے۔ اس حساب سے ایک سال کی زکوٰۃ ادا ہونے سے رہ جائے گی۔

اجتہاد کا شرعی تصور اور ایک مغالطہ

آج سے بیس پچیس سال قبل جب گرمیوں کے روزوں کا دور تھا تو ہمارے ہاں پاکستان میں ایک بحث چلی کہ کیا یہ ضروری ہے کہ روزے گرمیوں میں رکھے جائیں؟ ایک صاحب نے اخبار میں مضمون لکھا جسے ان کے ہم خیال لوگوں نے بہت سراہا کہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ یہ گرمیوں یعنی جون، جولائی اور اگست وغیرہ کے روزے بھٹی پر کام کرنے والے مزدور کے لیے اور مونجی کاشت کرنے والے کاشتکار کے لیے بہت سخت ہوتے ہیں۔ یہ کدو کرنا (مونجی کاشت کرنا) بڑا مشکل کام ہوتا ہے، سخت گرمی اور حبس کے موسم میں اوپر سے دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے اور نیچے زمین

میں گرم پانی ہوتا جس میں کاشت کار ایک ایک کر کے پودے زمین میں پیوست کرتے ہیں۔ تو ان صاحب نے کہا کہ یہ جو رمضان سارا سال گھومتا ہے کہ کبھی جولائی میں آجاتا ہے اور کبھی اگست میں آجاتا ہے تو علماء کرام کو امت پر ترس کرنا چاہیے کہ وہ اجتہاد کر کے رمضان کا گھومنا پھرنا بند کریں۔ یہ باقاعدہ مضمون چھپا اور اس پر بحث و مباحثہ ہوا کہ چونکہ علماء اجتہاد کر سکتے ہیں اس لیے علماء کو اس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔

آج کل ہمارے ہاں اجتہاد کا ایک خاص تصور پیدا ہو گیا ہے۔ ایک تو اجتہاد کا شرعی تصور ہے، وہ پہلے بھی تھا، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ شریعت میں اجتہاد کا تصور یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا ہو جائے جس کے بارے میں قرآن مجید یا نبی کریمؐ کی سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہیں ہے تو ایسی صورتحال میں علماء کرام قرآن و سنت کی روشنی میں کچھ شرائط کے ساتھ اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔ یعنی علماء کرام قرآن و حدیث میں ملتی جلتی مثالوں کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔ شریعت میں جو اجتہاد کا تصور ہے میں نے مختصراً اس کی تعریف عرض کی ہے۔ لیکن ایک اجتہاد کا تصور نیا ہے۔

ہمارے ہاں اجتہاد کا یہ تصور بن چکا ہے اور جدید ذہن کے نوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ علماء کرام کو دین کی طرف سے شاید کوئی صوابدیدی اختیار حاصل ہوتا ہے جو اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے اسے استعمال نہیں کرتے۔ اس کی مثال کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ کافی عرصہ پہلے میں ٹرین پر لندن سے مانچسٹر جا رہا تھا۔ ایک نوجوان نے میری وضع قطع سے دیکھا کہ مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں تو وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ سلام جواب کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا آپ مولانا صاحب ہیں؟ میں نے کہا، لوگ یہی کہتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا آپ اجتہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا بھئی مسئلہ بتاؤ، بات کیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا، نہیں پہلے آپ بتائیں کہ کیا آپ کے پاس اجتہاد کی اتھارٹی ہے؟ میں نے کہا بھئی مسئلہ بتاؤ، اگر میری سمجھ میں آیا اور میرے پاس اس کا حل ہوا تو بتا دوں گا۔ بہرحال اس نے بتایا کہ میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میری جاب ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ظہر اور عصر کی نمازیں بروقت ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا جس کا میں نے اپنے طور پر ایک حل نکال رکھا ہے۔ وہ یہ کہ میں ظہر کی نماز فجر کے ساتھ جبکہ عصر کی نماز مغرب کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ بھئی یہ جو عصر کی نماز تم مغرب کے ساتھ پڑھتے ہو اِس کی گنجائش تو شریعت میں ہے کہ نماز قضا ہوئی لیکن بہر حال ادا ہو گئی۔ لیکن یہ جو ظہر کی نماز تم فجر کے ساتھ پڑھتے ہو اِس کی گنجائش دینے کی میرے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اجتہاد کے غلط استعمال کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، میں تمہیں اس کا ایک حل بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایسی جاب کی تلاش کی کوشش جاری رکھو جہاں تم اپنی ساری نمازیں وقت پر پڑھ سکو، لیکن جب تک ایسی جاب نہیں ملتی تب تک ظہر اور عصر دونوں نمازیں مغرب کے ساتھ پڑھ لیا کرو، یہ نمازیں قضا ہوں گی لیکن بہر حال ہو جائیں گی۔

میں نے یہ واقعہ اس لیے عرض کیا ہے کہ آج کل اجتہاد کا ایک غلط تصور پایا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کو عیسائیت کے پاپائے روم کی طرح کے کوئی اختیارات حاصل ہیں۔ یعنی وہ کسی بھی حلال کو حرام اور کسی بھی حرام کو حلال قرار دے سکتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال کہ یہ مولوی صاحبان ضدی ہوتے ہیں اور عوام کو کوئی سہولت نہیں دینا چاہتے اس لیے یہ اپنا اجتہاد کا اختیار استعمال نہیں کرتے۔

خیر میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ مضمون نگار نے تجویز پیش کی کہ علماء کرام مل بیٹھ کر اجتہاد کریں اور رمضان کے مہینے کو کسی اچھے سے موسم میں بند کر دیں۔ ان صاحب نے کہا کہ میری ذاتی تجویز یہ ہے کہ فروری کا مہینہ رمضان کا ہو جبکہ یکم مارچ کو عید الفطر ہو، اس طرح رمضان کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور عید کا جھگڑا بھی طے ہو جائے گا۔ یہ لوکل و گلوبل مون سائٹنگ کمیٹیاں اور یہ چاند دیکھنے کے جھگڑے وغیرہ سب ختم ہو جائیں گے۔ اس پر بحث مباحثہ ہوا، میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ انہی دنوں جب میں نے اس موضوع پر روایات وغیرہ تلاش کیں تو میرے سامنے یہ ساری باتیں آئیں۔

بنی اسرائیل کے چالیس روزے

تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں بھی رمضان ہی کے روزے تھے، ان کا رمضان بھی سارا سال گھومتا تھا، انہیں بھی جولائی اور اگست کے روزے تنگ کرتے تھے اور انہوں نے بھی یہی تجویز اپنے علماء کے سامنے پیش کی۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے علماء نے ان کی بات مان لی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے علماء نے فیصلہ کیا کہ ٹھیک ہے لوگوں کو یہ سہولت دے دیتے ہیں کہ کسی اچھے موسم میں روزے رکھ لیا کرو۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ چونکہ یہ ہم روزوں کے اصل نظام میں گڑبڑ کر رہے ہیں، اس لیے تیس روزے تو پورے رکھیں گے لیکن ساتھ دس روزے کفارے کے بھی رکھیں گے۔ چنانچہ یہ جو مذہبی عیسائی چالیس روزے رکھتے ہیں اور ایسٹر اُن کی عید الفطر ہوتی ہے جو اپریل کے پہلے عشرے کے

دوران میں کسی اتوار کو یہ قرار دے دیتے ہیں۔ گویا مارچ کا مہینہ اور اپریل کا کچھ حصہ، یعنی تیس روزے پورے اور ساتھ دس کفارے کے۔

میں نے مضمون نگار سے کہا کہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل والوں نے گڑبڑ کی تھی تو تیس سے چالیس روزوں پر گئے تھے، جبکہ تم ہم سے گڑبڑ کروا رہے ہو تو تیس سے کم کر کے اٹھائیس روزوں پر لے جا رہے ہو۔ میں نے کہا، کچھ خدا کا خوف کرو یار۔ تین سال اٹھائیس کے اور چوتھے سال انتیس کے جبکہ تیسواں روزہ بالکل ختم جو کہ سب سے مشکل روزہ ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ تفسیری روایات کے مطابق بنی اسرائیل میں بھی رمضان چاند کا مہینہ تھا، اور وہ بھی سارے سال میں گھومتا تھا، انہوں نے اپنی سہولت کے لیے اس میں رد و بدل کی۔ لیکن اسلام نے سابقہ پوزیشن بحال کر دی کہ روزے رمضان کے ہی ہوں گے اور سارے موسموں میں اسی طرح گردش کریں گے۔ جبکہ روزے کا دورانیہ کم کر کے رات خارج کر دی گئی کہ صبح طلوعِ فجر سے روزہ شروع ہوگا اور غروبِ آفتاب تک رہے گا۔ یہ اسلام نے روزے کے نظام میں دو بڑی اصلاحات کیں۔

نبی کریمؐ کے رمضان کے معمولات

رمضان المبارک میں جناب نبی کریمؐ کے معمولات کیا ہوتے تھے؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان اور غیر رمضان میں حضورؐ کے معمولات میں تین باتوں کا فرق ہوتا تھا:

تمام رمضان کے روزے

پہلا فرق تو روزے کا ہی تھا کہ باقی سال کسی مہینے میں حضورؐ پورا مہینہ روزے نہیں رکھتے تھے۔ پیر و جمعرات یا پھر قمری مہینے کے درمیان کے تین روزے رکھتے تھے۔ آپؐ شعبان میں کثرت سے روزے رکھتے تھے اور پھر رمضان کے مکمل روزے رکھتے تھے۔ رمضان کے مکمل روزے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہیں، بلا مجبوری اس کا ترک کبیرہ گناہ ہے، مجبوری کے ساتھ ترک کرنے پر قضا واجب ہے، جبکہ بعض صورتوں میں کفارہ یا فدیہ دینا ضروری ہے۔

قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت

دوسرا فرق حضرت عائشہؓ یہ بتلاتی ہیں کہ رمضان میں حضورؐ کی قرآن مجید کی تلاوت باقی سال سے دُگنی ہو جاتی تھی۔ باقی سارا سال بھی حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتے

تھے۔ آپؐ خود تلاوت کرتے تھے اور دوسروں سے سنتے بھی تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی عبادت ہے اور اہتمام کے ساتھ قرآن مجید سننا بھی عبادت ہے۔ دونوں پر حضورؐ نے یکساں ثواب بتلایا ہے۔ فرمایا کہ قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہو تو پڑھنے والے کو بھی ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور سننے والے کو بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ باقاعدہ نیت کے ساتھ سنا جائے، سننے کا خاص اہتمام ہو اور آداب کے ساتھ سنا جائے۔

قرآن مجید سننے کے آداب کیا ہیں، اس کا دو باتوں سے اندازہ کر لیجئے۔ ایک تو حکم ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ یعنی کان متوجہ ہوں جبکہ زبان بے حرکت ہو، یہ تلاوتِ قرآن مجید سننے کے آداب میں سے ہے۔ جب حضرت جبریلؑ حضورؐ کے پاس وحی لے کر آتے اور آپؐ کو قرآن مجید کی تلاوت سناتے تو حضورؐ ان سے قرآن مجید سنتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھتے بھی جاتے تھے۔ ابتدا میں آپؐ کا یہ معمول رہا، اس خیال سے کہ جو کچھ سنا ہے وہ بھول نہ جائے اور کوئی لفظ آگے پیچھے نہ ہو جائے۔ لیکن اللہ رب العزت نے یہ کہہ کر اس بات سے منع فرما دیا کہ آپ وحی ختم ہونے سے پہلے قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کریں تاکہ آپ اسے جلدی جلدی پڑھ لیں، بے شک اس کا آپ کے دل میں جمع کرنا اور آپ سے پڑھا دینا ہمارے ذمے ہے، پھر جب آپ اس کی قراءت کر چکیں تو اس کی قراءت کا اتباع کیجئے، پھر بے شک اس کا کھول کر بیان کرنا ہمارے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ قرآن مجید سن رہے ہوں تو زبان کو حرکت مت دیں اور جلدی نہ کریں، یہ فکر دل سے نکال دیں کہ یہ آپ سے بھول جائے گا۔

اللہ رب العزت نے نبی کریمؐ سے قرآن مجید کے حوالے سے تین باتوں کا وعدہ کیا ہے: (۱) آپؐ کے سینے میں قرآن محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ (۲) آپ کی زبان سے قرآن کی صحیح تلاوت کروانا ہماری ذمہ داری ہے۔ (۳) اور پھر قرآن کا مفہوم اور مطلب آپ کے دل میں ڈالنا ہماری ذمہ داری ہے۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ حضورؐ قرآن مجید سنتے ہوئے قرآن مجید ہی پڑھتے تھے کوئی اور بات نہیں کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ قرآن مجید کی اس آیت سے ہمیں اندازہ کر لینا چاہیے کہ قرآن مجید کے سننے کے آداب کیا ہیں۔ آج کل ہم جس طرح قرآن مجید سنتے ہیں، کیا اس کی اجازت ہوگی؟ قرآن مجید پڑھا جا رہا ہوتا ہے اور ہماری گپ شپ چل رہی ہے، ہماری توجہ اور رخ کہیں

اور ہوتے ہیں۔ قرآن مجید اگر آداب کے ساتھ سنا جائے تو اس کا ثواب و اجر بہت ہے۔ یہ عبادت بھی ہے، سنت بھی ہے اور ثواب میں قراءت کے بالکل برابر ہے۔

جناب نبی کریمؐ جس طرح اہتمام سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اسی طرح اہتمام کے ساتھ قرآن مجید سنتے بھی تھے۔

صحابہ کرامؓ میں قرآن مجید کے بڑے بڑے قاری تھے، میں اس وقت ان میں سے دو قاریوں کا ذکر کرتا ہوں۔ حضورؐ نے خود چند صحابہؓ کو بڑا قاری کہا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے متعلق کہا کہ یہ سب سے بڑا قاری ہے۔ پھر حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ یہ چار پانچ صحابہ کرامؓ ہیں جن کو حضورؐ نے امت کے بڑے قاری قرار دیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا لہجہ بہت اچھا تھا، ان کی سُر اور آواز بہت اچھی تھی، خوبصورت انداز میں قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ان سے جناب نبی کریمؐ نے فرمایا لقد اوتیت من مزامیر آل داوود کہ ابو موسیٰ تیری گردن میں تو داؤد علیہ السلام کے خاندان کی سرفٹ ہوگئی ہے۔ ”مزمار“ سُر کو کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ کی طرف سے ابو موسیٰؓ کے لیے ایک تمغہ تھا۔ اس بارے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک دفعہ نبی کریمؐ نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے کہا کہ ابو موسیٰ! رات میں اور عائشہؓ، ہم دونوں میاں بیوی تمہارے محلے میں کسی کام سے گئے تھے، واپس آتے ہوئے آدھی رات کا وقت تھا، تمہارے گھر کے سامنے سے گزرے تو تم گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور باہر آواز آرہی تھی۔ تمہاری آواز سن کر ہم دونوں وہیں کھڑے ہوگئے اور کچھ دیر باہر کھڑے کھڑے تمہارا قرآن سنتے رہے۔ ابو موسیٰؓ نے حسرت سے کہا، یارسول اللہ! مجھے پتہ نہیں چلا، اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ آپ باہر کھڑے ہیں تو میں اور زیادہ لے اور مزے سے پڑھتا۔ وہ کیا عجیب تلاوت ہوگی جس نے حضورؐ کے قدم روک لیے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی بڑے قاری تھے۔ یہ وہ قاری تھے جن کے بارے میں جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جو آدمی قرآن مجید ایسا تازہ پڑھنا چاہتا ہے جیسے نازل ہو رہا ہو تو ابن ام عبد کے طریقے پر پڑھو۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کی کنیت ابنِ اُمِ عبد تھی۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے ایک دن بلایا اور فرمایا، عبداللہ مجھے قرآن مجید سناؤ۔ عبداللہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ آپ پر تو قرآن مجید نازل ہوتا ہے، میں آپ کو سناؤں؟ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا، ہاں تم مجھے قرآن مجید سناؤ اس لیے کہ میں

جس طرح قرآن مجید پڑھنے کا ثواب حاصل کرتا ہوں اسی طرح سننے کا ثواب بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں محدثین فرماتے ہیں کہ یہ ہماری تعلیم کے لیے تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس طرح پڑھنا سنت ہے اسی طرح سننا بھی سنت ہے۔ جس طرح قرآن مجید پڑھنا عبادت ہے اسی طرح توجہ کے ساتھ سننا بھی عبادت ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ پڑھتے بھی تھے اور سنتے بھی تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ دونوں بڑے قاری، عالم اور فقیہ تھے۔ ان دونوں کو حضورؐ نے یمن کے ایک ایک حصے کا گورنر بنا دیا تھا۔ یعنی یمن کے ایک حصے کا گورنر ایک کو، جبکہ دوسرے حصے کا گورنر دوسرے کو۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس ملاقات کے لیے آیا جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں میں مکالمہ ہوا۔ معاذ ابن جبلؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے پوچھا کہ بھئی تم قرآن مجید کیسے پڑھتے ہو، تمہارا کیا معمول ہے؟ ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا کہ میں تو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت بس پڑھتا ہی رہتا ہوں۔ ان کے جواب میں ابو موسیٰ اشعریؓ نے معاذ ابن جبلؓ سے پوچھا کہ آپ قرآن مجید کیسے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھئی مجھ سے تو ایسے نہیں ہوتا، میرا تو قرآن مجید پڑھنے کا وقت بھی مقرر ہے اور طریقہ بھی۔ آدھی رات سو کر اٹھتا ہوں، وضو کر کے تازہ دم ہوتا ہوں اور پھر نماز میں کھڑے ہو کر تسلی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں۔ مجھ سے تو یہ چلتے پھرتے نہیں پڑھا جاتا۔ یہ دونوں کا اپنا اپنا ذوق تھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک تھے۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور دونوں بڑے قاری ہیں۔

ہمارے گوجرانوالہ میں ایک بزرگ ہوتے تھے حضرت مولانا حافظ شفیق الرحمانؒ جامعہ خیر المدارس جالندھر کے فاضل تھے، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی انتظامیہ کے صدر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔ ان کی کریانے کی دکان تھی، دکان پر ہی بچوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ بہت اچھے حافظ تھے، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں انہوں نے پچیس سال قرآن مجید سنایا۔ ان کے بعد اتنا ہی عرصہ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق عطا فرمائی، الحمد للہ۔ تو حافظ شفیق الرحمن صاحب ہر وقت پڑھتے رہتے تھے، سودا بیچتے ہوئے، بازار میں جاتے ہوئے، لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے، میں جب بھی انہیں دیکھتا تھا وہ قرآن مجید پڑھ رہے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے ان سے دو سوالات کیے۔ ایک سوال تو سنجیدہ تھا جبکہ دوسرا سوال ذرا دل لگی کا تھا۔ میں نے پوچھا حضرت آپ کاروبار بھی کرتے ہیں، بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں اور باقی معمولات بھی ہیں، آپ دن رات میں کتنا قرآن مجید پڑھ لیتے ہیں؟

حافظ صاحب نے جواب دیا کہ ساری مصروفیات کے ساتھ ایک دن میں اٹھارہ پارے تو میرا معمول ہے لیکن بائیس تک بھی گیا ہوں۔ دوسرا سوال میں نے یہ کیا کہ حافظ صاحب آپ ہر وقت قرآن مجید پڑھتے رہتے ہیں، کہیں غیر اختیاری طور پر غسل خانے میں بھی تو نہیں پڑھتے رہتے۔ حافظ صاحب نے جواب دیا، یار کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اچانک مجھے خیال آتا ہے تو میں اپنی زبان روک لیتا ہوں کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ خیر یہ بڑا اچھا زمانہ تھا، لوگوں کا اچھا ذوق تھا، لوگ کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ آج کل تو ہم ایک دو پارے پڑھ کر تھک جاتے ہیں۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پہلی بار تراویح میں قرآن کریم ۱۹۶۲ء میں گکھڑ کے نواح میں ایک گاؤں بدوکی گوسائیاں میں سنایا۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں قرآن مجید حفظ مکمل کیا تھا۔ اس دور کی بات ہے کہ ایک دفعہ ہم نے بدوکی گوسائیاں کی ایک بڑی مسجد میں شبینہ رکھ لیا، سردیوں کی لمبی راتیں تھیں، ہم باری باری ایک ایک پارہ پڑھتے تھے۔ ایک بزرگ حافظ صاحب ہوتے تھے حافظ یامین صاحب، اللہ غریق رحمت فرمائے، وہ بھی دکان دار تھے اور پانی پت کے تھے۔ پہلی رات میں نے تیسرا پارہ پڑھا تو حافظ یامین صاحب یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ بھئی یہ آپ لوگ کیسے پڑھ رہے ہیں، ذرا مجھے پڑھنے دیتے ہو؟ ہم نے کہا، ٹھیک ہے آپ پڑھ لیں۔ حافظ صاحب کھڑے ہوئے اور چوتھا پارہ شروع کر دیا۔ اب حافظ صاحب پڑھتے جا رہے ہیں اور پڑھتے جا رہے ہیں کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ یہاں تک کہ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ یا اللہ حافظ صاحب کب رکوع کریں گے، لوگوں میں سے کچھ تو تھک کر بیٹھ گئے، کچھ نے نماز ہی توڑ دی۔ لیکن حافظ صاحب تو ایسے تھے کہ کہیں بھولتے بھی نہیں تھے کہ انہیں کوئی رکاوٹ ہو۔ چنانچہ سحری کا وقت ختم ہونے میں بیس پچیس منٹ رہ گئے تو ہم نے شور مچایا کہ خدا کے لیے بس کرو لوگوں کی سحری چلی جائے گی۔ چنانچہ حافظ صاحب نے سورہ یس پڑھ کر رکوع کیا۔ یہ تو میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ چوتھے پارے سے شروع کر کے سورہ یس ختم ہونے تک وہ پڑھتے رہے، اور رکے بھی ہمارے شور مچانے پر۔

تو میں نے عرض کیا کہ نبی کریمؐ کا رمضان میں قرآن مجید کی تلاوت کا معمول بڑھ جاتا تھا۔ آپ کی رات کی معمول کی تلاوت تو چلتی ہی تھی لیکن دن میں روزانہ حضرت جبرائیلؑ آتے تھے اور حضورؐ کے ساتھ قرآن مجید کا دور کرتے تھے۔ ہمارے ہاں جو حفاظ ایک دوسرے کو باری باری سناتے ہیں، ہم اسے دور کرنا یا تکرار کرنا کہتے ہیں۔ یہ جناب نبی کریمؐ اور جبرائیلؑ کی سنت ہے۔ دونوں رمضان میں روزانہ

عصر سے مغرب تک دور کیا کرتے تھے یعنی ایک دوسرے کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔

بے حد سخاوت

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کا تیسرا معمول یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں عام دنوں سے زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔ حضورؐ سارا سال تو سخی ہوتے ہی تھے لیکن رمضان میں سخاوت کی حد ہو جاتی تھی۔ تمام سال حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ آپؐ کے دروازے سے کوئی سائل خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ جس سوالی یا ضرورتمند کی ضرورت آپؐ اپنے پاس سے پوری کر سکتے تھے، آپؐ کرتے تھے۔ لیکن جس کی ضرورت آپؐ خود پوری نہیں کر سکتے تھے، اس کی سفارش کر دیتے تھے، یعنی کسی ایسے آدمی سے کہہ دیتے تھے جس سے امید ہوتی کہ یہ اس ضرورتمند کی ضرورت پوری کر دے گا۔ اب جب حضورؐ کے کہنے پر کسی نے نیکی کی تو پہلا ثواب تو حضورؐ کو ہی پہنچا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ نہ خود ضرورت پوری کر سکتے تھے اور نہ کوئی ایسا آدمی ہی ملتا تھا جو سوالی کی ضرورت پوری کر سکتا۔

حضرت ابو طلحہؓ کا ایثار قرآن کریم کی نظر میں

ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک شخص آیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کا مہمان ہوں، آپ مجھے کھانا کھلائیں۔ آپؐ نے اپنے سب گھروں سے باری باری پتہ کیا لیکن کسی گھر سے کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ حضورؐ نے مجلس میں کہا کہ کوئی ہے جو میرے مہمان کو کھانا کھلا دے۔ ابو طلحہ انصاریؓ اٹھے اور کہا یا رسول اللہ! میں کھلاتا ہوں۔ ابو طلحہؓ گھر گئے، جا کر بیوی سے پوچھا کہ کھانے کے لیے کچھ ہے؟ بیوی نے کہا، ہاں ایک آدمی کا کھانا ہے، یا تم کھالو، یا میں کھالوں، یا پھر مہمان کو کھلا دو۔ بچے بھی بھوکے ہیں۔ ابو طلحہؓ نے کہا کہ حضورؐ کا مہمان ہے، اب اسے تو ہم واپس نہیں کر سکتے۔ بچوں کو کسی طریقے سے بہلا پھسلا کر سلا دو اور کھانا دستر خوان پر رکھ دو۔ مجھے تو اخلاقاً ساتھ بیٹھنا ہے اس لیے تم ایسا کرنا کہ کسی بہانے چراغ بجھا دینا۔ میں ساتھ بیٹھ کر بہانے سے اپنا منہ ہلاتا رہوں گا، اس طرح مہمان کھانا کھالے گا۔ چنانچہ اس طرح انہوں نے مہمان کو کھانا کھلایا۔ اس صحابی کی شان میں قرآن کی یہ آیت اتری ویؤثرون علیٰ انفسھم (الحشر ۹) ''اور وہ (مہاجرین کو) اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اُن پر فاقہ ہو''۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں انصارِ مدینہ کی شان ذکر فرمائی۔ یعنی حضورؐ کو خود میسر ہوتا تو دے دیتے ورنہ سفارش کر دیتے۔ لیکن اگر پھر بھی کام نہ بنتا تو دُعا دے دیتے تھے کہ اللہ تمہاری ضرورت پوری کرے۔

میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ان میں سے بڑا عطیہ کون سا تھا؟ ایک آدمی کو حضورؐ سے کھانا مل گیا لیکن دوسرے کو حضورؐ کی دعامل گئی۔ تو زیادہ کس کو ملا، جس کو کھانا ملا یا جس کے لیے حضورؐ کے ہاتھ اٹھے؟

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اور رمضان میں تو حضورؐ اتنے سخی ہوتے تھے کالریح المرسلة کہ گرم موسم میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا کی طرح حضورؐ کی سخاوت ہوتی تھی۔ یہاں پتہ نہیں کیسا موسم ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں سخت حبس کے موسم اور شدید گرمی کے عالم میں جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو کیا مزے کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان میں تو کوئی بھی حضورؐ کے فیض سے محروم نہیں رہتا تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے رمضان المبارک کے حوالے سے حضورؐ کے یہ تین معمولات بیان کیے ہیں۔

رمضان المبارک کیلئے ہماری تیاری؟

حضراتِ محترم! رمضان شروع ہو رہا ہے، ہمیں اس کی تیاری کرنی چاہیے اور اس کے لیے اپنے اوقات کو فارغ کرنا چاہیے۔ ہماری عام تیاری تو یہ ہوتی ہے کہ کھانے پینے کی اشیا کے متعلق اہتمام کرتے ہیں کہ گھی پورا ہے، پراٹھے ملیں گے یا نہیں، دہی تو کم نہیں پڑ جائے گا وغیرہ۔ لیکن ہمیں جناب نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے طریقے کے مطابق تیاری کرنی چاہیے۔ اپنے اوقات کو نماز، تلاوتِ قرآن، تراویح اور تہجد کے لیے فارغ کرنا چاہیے۔ اور اس مقصد کے لیے ہمیں رمضان المبارک کے دوران اپنی باقی سال کی روزمرہ کی مصروفیات کو کم کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہمیں اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ وخیرات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ رمضان المبارک کا مہینہ عبادات کا سیزن ہوتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو آدمی اس سیزن میں خدا کو راضی نہ کر سکا وہ بڑا بد نصیب ہے۔ وہ آدمی جس کو صحت، تندرستی اور عافیت کی حالت میں رمضان ملا لیکن وہ اللہ کو راضی نہ کر سکا تو ظاہر ہے کہ وہ خوش نصیب نہیں ہے۔ میں اس کا محاورے کی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ جس کاروباری آدمی نے سیزن میں کمائی نہیں کی تو اس نے باقی سارا سال کیا کمانا ہے؟ جس نے سیزن میں چار پیسے نہیں بنائے اس نے باقی سال کیا بنانا ہے۔

اجر و ثواب کا الٰہی ضابطہ

چنانچہ رمضان المبارک عبادات کا سیزن ہے، اس میں تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب ملتا

ہے۔ بسا اوقات ہمیں یہ اشکال ہوتا ہے کہ یار اتنا چھوٹا سا عمل ہے اور مولوی صاحب اتنا بڑا ثواب بتا رہے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں مولوی صاحب کا کوئی دخل نہیں ہے، مولوی صاحب کا کام تو صرف بتانا ہوتا ہے، اصل احکامات تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اب یہی ثواب والی بات قرآن مجید سے پوچھ لیں۔ رمضان کی ایک رات زیادہ سے زیادہ کتنی لمبی ہوگی۔ سات آٹھ گھنٹے، سردیوں میں بارہ چودہ گھنٹے، اگر ناروے بھی چلے جائیں تو بیس گھنٹے کی ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایک رات پر ثواب کتنا دے رہے ہیں کہ ایک شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ رات وہی دس بارہ گھنٹے کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ایک رات کی عبادت کے بدلے میں ایک ہزار مہینہ نہیں بلکہ ایک ہزار مہینے سے بہتر کا بدلہ دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو نیت دیکھتے ہیں۔ فارسی کا ایک چھوٹا سا شعر ہے ؎

رحمت حق بہا، نہ می جوید
رحمت حق بہانہ می جوید

کہ اللہ کی رحمت یہ نہیں دیکھتی کہ عمل کتنا بڑا کیا ہے، بلکہ اللہ کی رحمت عمل کرنے والے کی نیت دیکھتی ہے اور بہانہ تلاش کرتی ہے کہ مجھے کچھ دینے کے لیے بہانہ دو۔ اللہ کے ہاں ثواب کا مدار عمل کی مقدار پر نہیں بلکہ ان دلی کیفیات پر ہوتا ہے جو اس عمل کے پیچھے کارفرما ہوتی ہیں۔ نیت، خلوص، توجہ اور عمل کی کیفیات۔ میں حوالے کے لیے ایک اور بات عرض کرتا ہوں، جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ میرا صحابیؓ ایک مد جَو خرچ کرے اور تم ایک احد پہاڑ سونے کا خرچ کرو تو یہ میرے صحابیؓ کی ایک مد جَو کے برابر نہیں ہے۔ اب احد پہاڑ سونے کا اور دو چار کلو جَو، اِن کا آپس میں کیا موازنہ ہو سکتا ہے؟ حضورؐ کے فرمان کے مطابق یہ دونوں برابر نہیں ہیں، اس لیے کہ صحابیؓ کے عمل کے پیچھے جو قلبی کیفیات ہیں وہ دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔

ایک بات مزید عرض کر کے میں اپنی بات سمیٹتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کم از کم ثواب کی حد تو بتائی ہے کہ کسی عمل پر دس سے کم نیکیاں نہیں دوں گا، لیکن کسی بھی نیکی کی زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں بتائی کہ اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔ یہ وعدہ تو قرآن مجید میں کیا ہے کہ دس سے کم نہیں دوں گا۔ ایک نیکی کے بدلے دس، ستر یا سات سو نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ جس فارمولے پر بھی بات کر لیں یہ سب کم سے کم کے فارمولے ہیں۔ کسی نیکی اور عبادت پر زیادہ سے زیادہ ثواب کی اللہ تعالیٰ نے کوئی حد نہیں بتائی۔ اب یہ ہماری ہمت اور خلوص پر ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کی حد اسے بتانی

پڑتی ہے جسے کوئی بجٹ پرابلم ہو کہ اس سے زیادہ میرے پاس نہیں ہیں، کہاں سے دوں گا۔ جیسے حکومتوں کو بجٹ پرابلمز ہوتے ہیں کہ فلاں مد میں ہمارے پاس اتنا فنڈ ہے، اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی بجٹ پرابلم نہیں ہے وہ جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ میں ان گزارشات کے ساتھ عرض کروں گا کہ رمضان المبارک شروع ہونے والا ہے، ہمیں کوشش بھی کرنی چاہیے، دعا بھی کرنی چاہیے اور رمضان المبارک کے لیے بطور خاص تیاری بھی کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اس رمضان المبارک کو ہمارے لیے دنیا و آخرت دونوں حوالوں سے بابرکت بنائے، باعث ثواب بنائے، باعث اجر بنائے، اور ہمیں اس مہینے، اس سیزن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

قرآنِ کریم کا مقصدِ نزول

(۲۳ جولائی ۲۰۱۰ء کو سیلڈن اسلامک سنٹر، لانگ آئی لینڈ، نیویارک میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، قرآن کریم کا نزول اسی مبارک مہینے میں ہوا اور اسی میں زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں رمضان المبارک کے دوران قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا معمول بڑھ جاتا ہے اور تراویح کے ساتھ ساتھ تہجد اور دیگر نوافل میں کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس مناسبت سے میں آج کی محفل میں اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہم قرآن کریم کس مقصد کے لیے پڑھتے ہیں اور اسے پڑھنا کس مقصد کے لیے چاہیے؟

ہم قرآن کریم کن مقاصد کیلئے پڑھتے ہیں؟

- ہم عام طور پر قرآن کریم پڑھتے اور سنتے ہیں کہ اس سے اجر و ثواب حاصل ہوگا جو بلاشبہ حاصل ہوتا ہے۔
- ہم قرآن کریم گھروں میں، کاروباری مراکز میں اور دفاتر میں برکت کے لیے پڑھتے ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت سے ہمیں برکات حاصل ہوتی ہیں۔
- ہم قرآن کریم کو شفا کے لیے پڑھتے ہیں اور قرآن کریم روحانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ جسمانی بیماریوں میں بھی شفا کا باعث بنتا ہے۔
- ہم اپنے مرحوم دوستوں اور بزرگوں کو ایصالِ ثواب اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی نسبت سے قرآن کریم پڑھتے ہیں اور یہ مقصد بھی یقیناً حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ وہ فوائد ہیں جو ہم قرآن کریم سے حاصل کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کا اپنا مقصد اور ایجنڈا کیا ہے؟ اس پر ہماری توجہ نہیں ہوتی۔

قرآن کریم کا اصل مقصد کیا ہے؟

ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اس طرح کا ہوگیا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بہت ہی معزز ہستی مہمان بن کر آجائے تو ہم اسے احترام اور پروٹوکول تو پورا دیں، اس کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہ

اٹھا رکھیں، اور اس کی آمد سے جتنے فوائد حاصل کر سکتے ہوں وہ بھی کریں، مگر اس سے یہ نہ پوچھیں کہ آپ کس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں؟ اور آپ کی آمد کا کوئی ایجنڈا بھی ہے یا نہیں؟ اسے خود غرضی کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ اسی خود غرضی والا ہے۔ ہم بحمد اللہ تعالیٰ قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے ساتھ عقیدت و محبت بھی رکھتے ہیں، اس کا ادب و احترام بھی کرتے ہیں، اس کی بے حرمتی پر ہماری غیرت بھی جوش میں آجاتی ہے، اور اس سے اجر و ثواب، رحمت و برکت اور شفاو مغفرت کے سارے فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آپ کیسے تشریف لائے ہیں اور آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ جبکہ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے نزول کے اصل مقصد کی طرف توجہ دیں۔

قرآن کریم نے اپنا ایجنڈا، موضوع اور مقصد آغاز میں ہی واضح کر دیا ہے۔ سورہ البقرہ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ ھدًی للمتقین ہے۔ قرآن کریم کا موضوع اور مقصد "ہدایت" ہے۔ یہ ھدًی للناس بھی ہے اور ھدًی للمتقین بھی ہے۔ یہ نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لیے آیا ہے، انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھانے آیا ہے، اور دنیا و آخرت کے معاملات میں ہمیں گائیڈ کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن کریم سے برکات و ثواب سمیٹنے کے ساتھ ساتھ رہنمائی حاصل کرنے کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کا اصل مقصد یہی ہے۔

قرآن کریم پڑھنے کے سات مقاصد

(۳۰ جولائی ۲۰۱۰ء کو ایشیا اسلامک سنٹر، ہیوسٹن، ٹیکساس، امریکہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور اسی میں زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سال کے بعد اس ماہ میں قرآن کریم کے ساتھ ہمارے تعلق کو تازہ کر دیتے ہیں، کچھ بیٹریاں چارج ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم کے ساتھ امتِ مسلمہ کے ربط میں تازگی آجاتی ہے، اسی حوالے سے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم ہم پڑھتے بھی ہیں سنتے بھی ہیں اور کچھ نہ کچھ یاد بھی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو کس غرض اور مقصد کے لیے پڑھتے ہیں؟ اور اسے اصل میں کس مقصد کے لیے پڑھنا چاہیے؟ اس کا اپنا مقصد اور ایجنڈا کیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کو پڑھنے اور سننے کی ضرورت ہے۔ ہم عام طور پر قرآن کریم کو چند مقاصد کے لیے پڑھتے ہیں جن کا تذکرہ اس وقت مناسب سمجھتا ہوں، مثلاً:

نماز میں قراءت

قرآن کریم پڑھنے سے ہمارا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ نماز ہم پر فرض ہے اور نماز میں قرآن کریم پڑھنا ضروری ہے، اس لیے ہم تھوڑا بہت قرآن کریم یاد کرتے ہیں تاکہ نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں۔ ہر مسلمان چند سورتیں یاد کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے تاکہ وہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکے۔

اس مسئلہ میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرائض و واجبات اور مؤکدہ سنتیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ادا ہو جائیں، اس کے لیے کم از کم کتنا قرآن کریم یاد کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے؟ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ چند سورتیں یاد کر لی جاتی ہیں اور انہی کو بار بار ہر نماز اور ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے، اس سے نماز ہو تو جاتی ہے لیکن سنت کے

مطابق نہیں ہوتی۔ جناب نبی اکرمؐ کی سنتِ مبارکہ یہ ہے کہ مختلف نمازوں اور رکعتوں میں مختلف سورتیں پڑھی جائیں اور ایک ہی سورت کو بار بار نہ دہرایا جائے۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو قرآن کریم کا کم از کم نصف آخری پارہ ضرور یاد کرنا چاہیے، اس کے بغیر پانچ نمازیں سنتِ نبویؐ کے مطابق ادا کرنا میرے خیال میں مشکل ہے۔ بہرحال ہمارا قرآن کریم پڑھنے سے ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ سورتیں یاد کر لیں تاکہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں۔

اجر و ثواب کا حصول

قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے ہمارا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ثواب حاصل کریں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ اجر ملے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے اجر ملتا ہے، ثواب حاصل ہوتا ہے اور ہمارے کھاتے میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ پڑھنے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور سننے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور دس کا یہ عدد متعیّن نہیں ہے بلکہ یہ کم از کم کی حد ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها ومن جاء بالسيئة فلا يجزىٰ الا مثلها (الانعام ۱۶۰)

"جس نے نیکی کا کوئی کام کیا اس کے لیے دس گنا اجر ہے اور جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اسے اس کے برابر بدلہ ملے گا۔"

نیکی کے ہر کام پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کا اجر و ثواب دس گنا سے شروع ہوتا ہے، یہ کم از کم کی حد ہے، ثواب میں زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، وہ کام کرنے والے کے خلوص و توجہ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر موقوف ہے۔ یہ سینکڑوں میں بھی ہو سکتا ہے، ہزاروں میں بھی ہو سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں اور اربوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ کسی سطح پر بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس لیے کہ اشکال وہاں ہوتا ہے جہاں دینے والے کو کوئی بجٹ پرابلم ہو کہ اس مد میں اتنی رقم موجود بھی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی بجٹ پرابلم نہیں ہے، اس لیے اس نے کسی نیکی میں زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ آپ کے کنکشن کی پاور پر منحصر ہے کہ وہ کتنے وولٹیج کھینچ سکتا ہے، اُدھر سے کوئی کمی نہیں ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے کہ نیکی اور ثواب کسے کہتے ہیں؟ اور یہ جو دس، بیس، سو، ہزار نیکیاں ملنے کی بات کی جاتی ہے، ان میں عملاً ملتا کیا ہے؟ ایک صاحب نے یہی سوال کیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ آخرت کی کرنسی ہے، اس لیے کہ جس طرح دنیا میں ہمارے معاملات اور لین دین ڈالر، یورو، پونڈ، ریال، درہم اور روپے کے ذریعے طے پاتے ہیں اور ہم ان کرنسیوں کے تبادلے سے اپنے معاملات نمٹاتے ہیں، اسی طرح آخرت میں ہمارے معاملات، نیکیوں اور گناہوں کے تبادلے سے طے پائیں گے۔ وہاں ڈالر، ریال اور روپیہ نہیں چلے گا بلکہ کسی بھی شخص کے ساتھ لین دین نمٹانے کے لیے یا نیکیاں دینا پڑیں گی اور یا اس کے گناہ اپنے سر لینے پڑیں گے۔ اس لیے نیکی اور گناہ دونوں آخرت کی کرنسیاں ہیں، ایک پازیٹو ہے اور دوسری نیگیٹو ہے، اور انہی کے ذریعے ہمارے آخرت کے معاملات نمٹائے جائیں گے۔ ہم دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو جانے سے پہلے وہاں کی کرنسی کا انتظام کرتے ہیں تاکہ وہاں صحیح طور پر وقت گزار سکیں، اسی طرح آخرت کے دور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں وہاں کی زیادہ سے زیادہ کرنسی کا بندوبست کر لینا چاہیے تاکہ وہاں کی زندگی بہتر ہو سکے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم اس نیت سے بھی پڑھتے ہیں کہ ثواب حاصل ہو گا۔

خیر و برکت کا ماحول

تیسرے نمبر پر ہم قرآن کریم کی تلاوت برکت کے لیے کرتے ہیں۔ نیا مکان بنائیں، کاروبار شروع کریں، یا دفتر کھولیں تو برکت کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ویسے بھی باذوق حضرات اپنے گھروں دکانوں، دفاتر، کھیتوں اور کاروباری مراکز میں قرآن کریم کی تلاوت اور ذکر و افکار کا معمول رکھتے ہیں اور قرآن کریم سے ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے گھروں میں برکت و رحمت کا ماحول نہیں رہا کیونکہ قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی، نماز کا ماحول نہیں ہے، ذکر و اذکار کا معمول نہیں ہے اور درود شریف پڑھنے کا ذوق نہیں ہے۔ ہمیں اکثر شکایت رہتی ہے کہ گھروں میں برکت نہیں رہی، باہمی اعتماد کی فضا نہیں رہی، کاروبار میں رکاوٹ رہتی ہے، رشتوں میں جوڑ نہیں ہے اور بے سکونی کی فضا ہے۔ یہ ماحول جب بڑھتا ہے تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور ہم علماء کرام کے پاس اور عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کسی نے کچھ کر دیا ہے آپ بھی کچھ کریں، وہ غریب

کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ کرنے والے کرتے ہیں، ان کے اثرات بھی ہوتے ہیں، اور علاج کرنے والوں کا علاج بھی مؤثر ہوتا ہے، لیکن کیا ہمارے گھروں میں سب کچھ یہی ہو رہا ہے؟ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، ہماری گھروں میں برکت نہ رہنے اور نحوست و بے برکتی کے پھیلنے کا اصل سبب کچھ اور ہے جس پر ہمیں ضرور غور کرنا چاہیے اور میں پڑھے لکھے دوستوں کو اس پہلو پر غور کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں اس بات پر غور کر لیجئے کہ رحمتیں اور برکتیں لے کر فرشتے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام عالم اسباب کے درجے میں انہی کے سپرد کر رکھا ہے۔ مگر ہمارے گھروں کا ماحول فرشتوں کی آمد و رفت کے لیے سازگار نہیں ہے۔ فرشتے وہاں آتے ہیں جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، جہاں نماز پڑھی جاتی ہے، ذکر و اذکار کا ماحول ہوتا ہے، درود شریف پڑھا جاتا ہے اور خیر کے اعمال ہوتے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ البیت الذی لیس فیہ القرآن کالبیت الخرب وہ گھر جس میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ ویران گھر کی طرح ہے۔ دوسری حدیث میں جناب نبی اکرمؐ فرماتے ہیں کہ صلوا فی بیوتکم ولا تجعلوھا قبورا گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔ گویا گھروں کی آبادی نماز اور تلاوت قرآن کریم سے ہے، اور جن گھروں میں نماز اور تلاوت کا معمول نہیں ہے وہ آباد گھر نہیں ویران اور اجڑے ہوئے گھر اور قبرستان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر اس کا معمول نہیں رہا اس لیے فرشتوں کا آنا جانا بھی نہیں رہا۔

اس کے برعکس ہمارے گھروں میں جو کچھ ہوتا ہے اس پر بھی ایک غیبی مخلوق کی آمد و رفت رہتی ہے، جو فرشتے بہرحال نہیں ہیں، وہ مخلوق جن و شیاطین کی ہے۔ وہ آتے ہیں تو اپنے اثرات لے کر آتے ہیں اور اپنی نحوستیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ شیاطین کی نحوستیں کس قسم کی ہوتی ہیں؟ اس پر جناب نبی اکرمؐ کا ایک ارشاد گرامی سن لیجئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ شیاطین کا ایک پورا نظام ہے جو دنیا میں کام کر رہا ہے اور دنیا کے مختلف اطراف میں شیاطین کی بڑی تعداد ہر وقت کام کرتی ہے اور بڑے شیطان کو اس کی رپورٹ بھی پیش کرتی ہے جو پانی پر تخت بچھائے ہوئے ہے اور اپنے شیطانی نیٹ ورک کے کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اپنے جس کارندے کو سب سے بڑی شاباش دیتا ہے اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے سینے سے لگاتا ہے، اسے اس بات پر شاباش ملتی ہے کہ وہ کسی گھر میں جھگڑے کا ایسا ماحول پیدا کر دے کہ میاں بیوی میں طلاق ہو جائے، کسی گھر میں طلاق کا ہو جانا شیطان کے نزدیک اس

کے کسی کارندے کا سب سے اچھا عمل ہوتا ہے جس پر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں شیطانوں کی آمد و رفت ہوگی تو اسی طرح کی بے برکتی اور نحوست ہو گی اور اسی بے اتفاقی اور بے اعتمادی کا دور دورہ ہو گا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں شیاطین کی آمد و رفت کو روکیں اور فرشتوں کی آمد و رفت کا ماحول بنائیں جو قرآن کریم کی تلاوت اور نماز و ذکر کی کثرت سے بنے گا۔ ایک مثال سے بات سمجھ لیجئے کہ میرا گھر اگر صاف ستھرا ہے، غسل خانے اور نالیوں میں صفائی ہے، گھر کے صحن میں کیاری موجود ہے جس میں پھول کھلے ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس ماحول میں بلبل آئے گی، تتلیاں آئیں گی، جگنو آئیں گے۔ لیکن اگر میرے گھر میں صفائی نہیں ہے، غسل خانہ اور نالیاں گندی ہیں اور کوڑا کرکٹ ہر طرف بکھرا ہوا ہے تو مکھیاں بھنبھنائیں گی، مینڈک ٹرائیں گے، مچھروں اور کاکروچوں کا ہر طرف بسیرا ہو گا، اس پر میں یہ کہنا شروع کر دوں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور سارے محلے کے کاکروچ اکٹھے کر کے میرے گھر میں بھیج دیے ہیں تو کس قدر عجیب بات ہو گی۔

میرے گھر میں بلبل اور جگنو کا ماحول ہو گا تو وہ آئیں گے۔ اور مچھروں اور مکھیوں والی فضا ہوگی تو وہ ڈیرہ ڈالیں گے۔ اس کے لیے کسی کو ملامت کرنے کی بجائے مجھے اپنے گھر کے ماحول کی صفائی کرنا ہوگی اور اسے بہتر بنانا ہو گا۔ اسی طرح میرے گھر میں اگر فرشتوں کی آمد و رفت ہوگی تو وہ آئیں گے اور رحمت و برکت لائیں گے۔ اور اگر ہر وقت شیاطین ڈیرہ ڈالے رہیں گے تو ان سے بے برکتی، نحوست اور نا اتفاقی ہی ملے گی، اور وہی کچھ ہو گا جس کی ہمیں اپنے گھروں میں اس وقت شکایت رہتی ہے۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ تیسرا مقصد جس کے لیے ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں برکت کا حصول ہے اور وہ اس عمل پر بلا شبہ حاصل ہوتی ہے۔

بیماریوں سے شفا

چوتھا مقصد جس کے لیے ہم عام طور پر قرآن کریم پڑھتے ہیں، شفا کا حصول ہے، اور وہ بھی قرآن کریم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کریم ہماری جسمانی بیماریوں کی شفا بھی ہے اور روحانی و اخلاقی بیماریوں کا بھی علاج ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنے آپ کو شفا کہا ہے اور فرمایا ہے کہ

قد جاءتکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور (یونس ۵۷)

"تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور وہ سینوں کی بیماریوں

کے لیے شفا ہے۔“

یہ شفا اصلاً تو روحانی بیماریوں کی ہے لیکن اس کے ساتھ جسمانی بیماریوں کے لیے بھی شفا ہے۔
بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابو سعید خدریؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ سفر پر تھے کہ ایک بستی کے قریب رات کا وقت ہو گیا اور انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ وہ مسافر ہیں انہیں کھانا کھلا دیا جائے۔ بستی والوں نے اس سے انکار کر دیا تو وہ بستی کے قریب ایک جگہ ڈیرہ لگا کر سو گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بستی کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا، زہر کا اثر دماغ تک پہنچا تو وہ بے قابو ہونے لگا، بستی والوں نے اپنے تئیں علاج وغیرہ کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، انہیں خیال آیا کہ جو لوگ بستی سے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علاج موجود ہو، وہ نصف شب کے وقت ان کے پاس آئے اور کہا ہمارے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا ہے اور ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، تمہارے پاس کوئی علاج ہو تو ہمارے ساتھ آؤ اور ہم پر مہربانی کرو۔

ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہ انہوں نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا اس لیے ہم نے کہا کہ علاج ہمارے پاس ہے مگر ہم معاوضہ کے بغیر علاج نہیں کریں گے اور معاوضہ تیس بکریاں ہو گا۔ وہ آمادہ ہو گئے، ہم نے جا کر اسے دم کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ ہم بکریاں لے کر واپس آئے تو خیال ہوا کہ یہ بکریاں جو ہم نے دم کے عوض لی ہیں شاید ہمارے لیے جائز نہ ہوں، اس لیے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کریں گے، اس کے بعد ان بکریوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو سارا واقعہ سنایا گیا تو آپ نے دل لگی کے طور پر فرمایا کہ ان بکریوں میں سے میرا حصہ بھی نکالو، یہ اشارہ تھا کہ بکریاں لے کر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ نبی اکرمؐ نے اس موقع پر پوچھا کہ دم کس نے کیا تھا اور کیا پڑھا تھا؟ ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ میں نے دم کیا تھا اور سورۃ فاتحہ پڑھی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت نے پوچھا کہ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس میں شفا ہے تو ابو سعید خدریؓ نے عرض کیا کہ ایک بار آپ کی زبان سے سنا تھا کہ اس سورۃ کا نام ”الشفاء“ بھی ہے، اسی یقین پر میں نے دم کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی۔

اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرمؐ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے آخری تین سورتیں جو ”معوذات“ کہلاتی ہیں یعنی قل ہو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے تھے اور ان ہاتھوں کو پورے جسم پر پھیرتے تھے۔ آخری

ایام میں جب کمزوری بڑھ گئی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر نبی اکرمؐ کے ہاتھوں پر پھونکتی تھی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے جسم پر پھیرتی تھی۔ معوذات کا یہ پڑھنا برکت کے لیے تھا اور شفا کے لیے تھا۔ اور قرآن کریم کی تلاوت سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

ایصال ثواب اور بخشش

قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارے ذہنوں میں پانچواں مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وفات پانے والے کسی بزرگ، دوست، ساتھی اور رشتہ دار کو ایصالِ ثواب کے لیے ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ قرآن کریم سے یہ مقصد اور فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے، ایصالِ ثواب بھی ہوتا ہے اور قرآن کریم کی برکت سے اللہ تعالیٰ مغفرت اور بخشش بھی فرماتے ہیں۔

رغبت و کشش کا ذریعہ

جبکہ قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ قراء کرام عام جلسوں میں اچھے سے اچھے لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں جس سے لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی طرف رغبت ہوتی ہے، قرآن کریم کے اعجاز کا اظہار ہوتا ہے، اور غیر مسلموں کے سامنے قرآن کریم کی اچھے لہجے میں تلاوت ان کی قرآن کریم کی طرف کشش کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ پانچ چھ مقاصد جن کا میں نے ذکر کیا ہے دراصل وہ فوائد ہیں جو ہمیں قرآن کریم سے حاصل ہوتے ہیں اور ہم قرآن کریم کی تلاوت یا سماع سے یہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت سے یہ سارے فائدے ملتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ان فوائد کا منبع بنایا ہے، مگر سوال یہ ہے جس کی طرف میں خود کو اور آپ سب حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کا اپنا ایجنڈا اور مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ دنیا کی کوئی کتاب ہم پڑھتے ہیں تو اس کا موضوع اور مقصد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس موضوع پر اور کس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن قرآن کریم کو پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس کا اپنا موضوع اور مقصد کیا ہے اور یہ کس سبجیکٹ کی کتاب ہے؟ تاریخ کی ہے، سائنس کی ہے، سیاست کی ہے، طب کی ہے، ادب کی ہے، یا کون سے فن کی ہے۔ ہم اس کتاب اللہ کو اپنے اپنے ذوق کے موضوعات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش تو کرتے رہتے ہیں کہ سائنس سے دلچسپی والا مفسر اس کی تفسیر میں پوری سائنس بیان کر دے گا، جغرافیہ

کے ذوق کا عالم اس میں جغرافیے کو سمونے کی کوشش کرے گا، منطق و فلسفہ کا عالم اسے منطق و فلسفہ کا نمائندہ بنانے میں قوت صرف کرے گا، اور طب کی دنیا کا شناور اسے علاج و معالج کی کتاب بنانے میں صلاحیتوں کو استعمال کرے گا، مگر اللہ تعالیٰ کے اس آخری کلام کا اپنا موضوع کیا ہے؟ اس کی طرف کم لوگوں کی توجہ ہوتی ہے۔

ہدایت اور راہنمائی

قرآن کریم نے اپنا موضوع صرف ایک لفظ میں بیان کیا ہے اور وہی اس کا اصل مقصد ہے جو تلاوت کا آغاز کرتے ہی سامنے آجاتا ہے۔ سورہ البقرہ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے کہ ذٰلک الکتاب لا ریب فیه هدی للمتقین (البقرہ ۲) یہ کتاب شک و شبہ سے بالاتر ہے اور متقین کے لیے "ہدایت" ہے۔ یعنی اس کا اصل موضوع ہدایت ہے۔ یہ نسلِ انسانی کی راہنمائی کے لیے آئی ہے کہ اسے دنیا میں کس طرح رہنا ہے اور انسانوں کو اس دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ قرآن کریم کا اصل موضوع "ھدًی" ہے۔ یہ ھدی للناس بھی ہے اور ھدی للمتقین بھی ہے۔ اپنے خطاب کے حوالے سے یہ ھدی للناس ہے مگر نفع کے اعتبار سے ھدی للمتقین ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھ لیا جائے کہ کسی گاؤں میں بجلی نہیں تھی، گاؤں والوں کی کوشش سے بجلی منظور ہوگئی اور گاؤں سے باہر اس مقصد کے لیے ٹرانسفارمر لگا دیا گیا۔ اب یہ ٹرانسفارمر سارے گاؤں کے لیے ہے لیکن بلب اس کا روشن ہوگا جس کا کنکشن ہوگا۔ دو میل دور اگر کسی گھر کا کنکشن ہے تو اس کی ٹیوب بھی چلے گی اور اے سی بھی چلے گا، مگر ساتھ والے مکان کا کنکشن نہیں ہے تو اس کا زیرو کا بلب بھی روشن نہیں ہوگا۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے خطاب کے حوالے سے ھدی للناس ہے لیکن فائدہ اسی کو ہوگا جس کا ایمان کا کنکشن ہوگا۔

یہ "ھدًی" کیا ہے؟ اس پر بھی غور کر لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو دو باتیں اسی وقت فرما دی تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین (سورہ الاعراف ۲۴) تمہیں زمین میں رہنے کو جگہ اور زندگی کے اسباب ملیں گے لیکن یہ ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت کے لیے ہوں گے۔ یہ مقررہ مدت ایک فرد کے لیے چالیس پچاس ساٹھ سال کی وہ زندگی ہے جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے، اور نسل انسانی کے لیے وہ چند ہزار سال کا وقت ہے جو اس کے لیے اس دنیا میں مقرر ہے۔

(۲) جبکہ دوسری بات اللہ رب العزت نے یہ واضح طور پر فرمادی تھی کہ اما یأتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیہم ولاھم یحزنون (البقرہ ۳۸) جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئیں گی توجس نے میری ہدایات کے مطابق دنیا کی زندگی بسر کی وہ خوف و حزن سے نجات پائے گا یعنی جنت میں واپس آئے گا۔ اور جس نے میری ہدایات کو جھٹلا دیا اسے دوزخ میں جانا ہوگا۔

گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا کی محدود زندگی تم اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد نہیں ہو بلکہ میری ہدایات کے پابند ہو جو میری طرف سے تمہارے پاس آتی رہیں گی۔ قرآن کریم اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ میں وہ "ھدًی" ہوں جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے تم سب پابند ہو۔ یعنی قرآن کریم نسلِ انسانی کے تمام طبقات اور تمام افراد کو یہ بتانے آیا ہے کہ تم نے اس دنیا میں کیسے رہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ یہ سیاستدانوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے، حکمرانوں کی بھی، سائنس دانوں کی بھی، ڈاکٹروں کی بھی، انجینئروں کی بھی، جغرافیہ دانوں کی بھی، اور فلسفیوں اور منطقیوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے۔

اس لیے قرآن کریم کا اصل موضوع اور مقصد یہ ہے کہ ہم اسے ہدایت اور راہنمائی کے لیے پڑھیں اور اس کی ہدایات کی روشنی میں اپنی زندگی کے معاملات طے کریں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اس طرح کا ہے کہ جیسے کسی کے ہاں کوئی بہت ہی معزز مہمان آجائے وہ اسے پورا پروٹوکول دے، اس کی خدمت کرے اور اس کی آمد سے جتنے فوائد حاصل ہوسکتے ہوں وہ بھی حاصل کرے، لیکن اس سے اس کی آمد کا مقصد نہ پوچھے کہ آپ کس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں۔ یہ طرزِ عمل خود غرضی کہلاتا ہے اور ہمارا قرآن کریم کے ساتھ خدانخواستہ یہی خود غرضی والا معاملہ چل رہا ہے۔ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے محبت و عقیدت بھی ہمارے دلوں میں ہے، اس کا ادب و احترام بھی کرتے ہیں، اس سے سارے فائدے بھی حاصل کرتے ہیں، مگر اس سے یہ نہیں دریافت کرتے کہ اس کی آمد کا مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟

قرآن کریم کے ساتھ ہماری عقیدت اور اس کا ادب و احترام ہمارا قیمتی اثاثہ ہے، اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم آج کے مسلمانوں نے اپنا بہت کچھ گنوا دیا ہے مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ تعلق اور محبت و عقیدت بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی قائم ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی بھی مسلمان نہ قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت کرتا ہے اور نہ ہی جناب نبی اکرمؐ کی

شانِ اقدس میں گستاخی اس کے لیے قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اسے غصہ آتا ہے اور وہ غیرت و جذبات کا بے ساختہ اظہار کرتا ہے، جو آج کی دنیا کے لیے تعجب و حیرت کا باعث ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان بڑی جذباتی قوم ہے اور غصہ والی قوم ہے۔ مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ یہ جذباتی محبت ہی ہمارا اصل اثاثہ ہے اور سرمایۂ حیات ہے۔ البتہ ہمیں صرف اس پر قناعت کرنے کی بجائے قرآن کریم اور سنتِ نبویؐ کو اپنی زندگی کا راہنما بنانا چاہیے کہ قرآن و سنت کا اصل مقصد یہی ہے اور اسی راستے پر چل کر ہم دنیا و آخرت میں نجات اور سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

حدیثِ نبویؐ کی ضرورت و اہمیت

(رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ (۲۰۱۱ء) کے پہلے عشرہ کے دوران مکی مسجد بروکلین نیو یارک میں مختلف نشستوں سے گفتگو کا خلاصہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مکی مسجد کے خطیب و امام مولانا حافظ محمد صابر صاحب نے فرمایا ہے کہ میں چار پانچ روز تک یہاں مقیم ہوں تو نمازِ فجر کے بعد ایک حدیث بیان کر دیا کروں، میں نے سوچا ہے کہ حدیث بیان کرنے کی بجائے حدیثِ نبویؐ کے بارے میں مختصراً کچھ بیان ہو جائے، جو تھوڑا تھوڑا کر کے چار پانچ روز میں مکمل کر دوں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

حدیث کا معنیٰ و مفہوم

"حدیث" عربی زبان میں بات چیت اور گفتگو کو کہتے ہیں، لیکن جب ہم مذہبی حوالے سے حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد ہر وہ بات ہوتی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و منسوب ہو، یا ان کے بارے میں کسی روایت میں مذکور ہو۔ گویا کسی قول، عمل، یا واقعہ میں جناب نبی اکرمؐ کا ذکر آجائے تو وہ حدیث بن جاتا ہے اور حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے بقول حدیثِ نبویؐ تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے۔

قرآن کریم کے ساتھ حدیث کا تعلق

رمضان المبارک میں ہم قرآن کریم عام دنوں سے زیادہ پڑھتے سنتے ہیں، اور یہاں بھی تراویح میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزانہ قرآن کریم سماعت کر رہی ہے۔ قرآن کریم کے ساتھ حدیث کا کیا تعلق ہے؟ اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا:

حدیثِ نبویؐ قرآن کریم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

پہلی بات یہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ قرآن کریم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ہم قرآن کریم کے الفاظ، جملوں اور آیات تک حدیث کے ذریعے ہی پہنچتے ہیں۔ اگر حدیث کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو قرآن کریم تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ ہمارے علم میں ہے کہ قرآن کریم کی پہلی آیات جو نازل ہوئی تھیں وہ سورۃ

العلق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربک الاکرم۔ الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم۔ کم و بیش ہر مسلمان یہ جانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ پانچ آیات قرآن کریم کی وہ پہلی آیات ہیں جو غارِ حرا میں جناب نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی تھیں۔ مگر یہ بات ہمیں معلوم کیسے ہوئی؟ اور کس ذریعہ سے ہم نے ان پانچ آیات تک رسائی حاصل کی؟ یہ ذریعہ حدیث نبویؐ کی وہ روایت ہے جس میں غارِ حرا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور جناب نبی اکرمؐ پر وحی کے نزول کے آغاز کی کیفیات ذکر کی گئی ہیں۔ اگر یہ واقعہ اور اس کے بارے میں یہ روایات ہمارے علم میں نہ ہوں اور ہم ان پر یقین نہ رکھیں تو قرآن کریم کی ان پانچ آیات تک رسائی کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اسی طرح ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ پہلی آیات کریمہ سورۃ العلق والی ہیں، جب ہم قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو سورۃ العلق کی پانچ آیات سے نہیں بلکہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیات کی تلاوت سے آغاز کرتے ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی تلاوت اس ترتیب سے نہیں کرتے جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا۔ ترتیب کی اس تبدیلی کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی دلیل یہی ہوگی کہ جناب نبی اکرمؐ نے اسے اس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے کون سی آیت اور سورت کس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے، یہ بات ہمیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے؟ اور قرآن کریم کی ترتیبِ نبویؐ معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے پاس کیا ہے؟ یہی کہ کوئی صحابی نبی اکرمؐ سے روایت کرے گا کہ فلاں سورۃ نبی اکرمؐ نے اس ترتیب کے ساتھ پڑھی ہے اور فلاں آیت کو اس ترتیب کے ساتھ تلاوت کیا ہے۔ یہ روایت جو قرآن کریم کی ترتیب کے بارے میں کوئی صحابی بیان کر رہا ہے یہی حدیث کہلاتی ہے۔ اور قرآن کریم کی اس ترتیب تک رسائی کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

پھر قرآن کریم کے اس مصحف کو دیکھ لیجئے جو ہمارے پاس موجود ہے اور مصحفِ عثمانی کہلاتا ہے۔ قرآن کریم کو اس ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں حضرت زید بن ثابتؓ نے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے لکھا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں قرآن کریم کتابی شکل میں مرتب نہیں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ حفاظ کرام بکثرت موجود تھے اور ویسے بھی اس معاشرے میں حافظہ اور یادداشت پر اس قدر اعتماد کیا جاتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کو کمزوری سمجھا جاتا تھا۔ اس کی

ضرورت حضرت ابو بکرؓ کے دورِ خلافت میں مختلف جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے محسوس کی۔ اس کی بنیاد احتیاط اور تحفظ پر تھی کہ حفاظ کرام کثرت کے ساتھ جام شہادت نوش کر رہے ہیں، کہیں قرآن کریم کی حفاظت کے بارے میں کوئی مشکل نہ پیدا ہو جائے۔ اس تحفظ اور احتیاط کے ذہن سے حضرت عمرؓ کی تجویز بلکہ اصرار پر حضرت ابو بکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے قرآن کریم کا ایک نسخہ کتابی شکل میں لکھوا کر محفوظ کر لیا، جسے بعد میں حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ ضروری تحفظات اور احتیاطات کے حوالے سے دوبارہ لکھوا کر اس کے چند نسخے عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں بھجوا دیے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم کا یہ کتابی مصحف کس بنیاد پر مرتب کیا تھا اور ان کے پاس اس کا ذریعہ کیا تھا؟ حضرت زید بن ثابتؓ خود قرآن کریم کے حافظ تھے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ اصول قائم کر لیا تھا کہ ہر آیت پر جناب نبی اکرمؐ سے سننے والے کم از کم دو اور صحابی شہادت دیں گے تو وہ اسے تحریر میں لائیں گے۔ اس اصول پر انہوں نے سارا قرآن کریم تحریر کر لیا مگر سورہ یونس کی آخری دو آیات اور سورہ الاحزاب کی ایک آیت پر انہیں الجھن پیش آگئی کہ ان پر صرف ایک صحابی ان آیات کو جناب نبی اکرمؐ سے سننے کی گواہی دے رہے تھے، وہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ تھے، ان کے ساتھ دوسرا گواہ نہیں مل رہا تھا۔ لیکن چونکہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک واقعہ میں حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو دو گواہوں کی شہادت قرار دے رکھا تھا، اس لیے ان آیات کو اسی بنیاد پر قرآن کریم میں تحریر کیا گیا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جن روایات کی بنیاد پر قرآن کریم کا یہ مصحف مرتب اور تحریر کیا، وہ احادیث ہی ہیں اور انہی احادیث کے ذریعے ہم نے یہ مصحف حاصل کیا ہے۔ اس لیے میری پہلی گزارش یہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ قرآن کریم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے، اس ذریعہ کو درمیان سے ہٹا دیں تو ہمارا قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور ترتیب تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بعد حدیث پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لیے کہ حدیث پر ایمان نہیں ہوگا تو قرآن کریم پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔

قرآن کریم کے ساتھ نبی اکرمؐ بھی واجب الاتباع ہیں

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کو بھی مطاع اور واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ اور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو قیامت تک مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ کا درجہ دیا ہے جس کی قدم بہ قدم پیروی ضروری ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ کے طور پر آپ کی قدم بہ قدم پیروی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں آنحضرتؐ کے ارشادات و اقوال، احوال و افعال، اور واقعات کا علم ہو۔ اس کے بغیر ہم اس فریضہ کی انجام دہی میں سرخرو نہیں ہو سکتے۔ اور یہ اقوال و افعال اور واقعات و کیفیات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیثِ نبویؐ ہے، اسی کے ذریعے ہم کسی معاملہ میں جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور آپؐ کی منشا معلوم کر کے اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

نبی اکرمؐ قرآن کریم کے شارح ہیں

تیسرے نمبر پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کی کسی آیت کریمہ کے سمجھنے میں الجھن پیش آئے تو اسے حل کرنے کے لیے سب سے پہلے جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ صاحبِ قرآن ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ بھی ہیں، وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو جب کسی آیت یا جملہ کا مفہوم سمجھنے میں الجھن ہوتی تھی تو وہ نبی اکرمؐ سے رجوع کرتے تھے، اس سلسلہ میں بیسیوں واقعات حدیث و تفسیر کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے مثال کے طور پر ایک کا ذکر کر دیتا ہوں۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ

یا ایہا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم (المائدہ ۱۰۵)

”اے ایمان والو! تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو دوسرا کوئی اگر گمراہ ہوتا ہے تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا اگر تم خود ہدایت پر رہو۔“

اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دوسروں کی گمراہی کے بارے میں فکر اور تردّد کرنے کی ضرورت نہیں، حالانکہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خود بھی جہنم کی آگ سے بچیں، اپنے گھر والوں کو بھی بچائیں، اور معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ماحول قائم کریں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مرتدین، منکرینِ ختم نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف عملی جہاد کا اعلان کیا تو کسی نے یہ آیت کریمہ پڑھ دی۔ اس ماحول میں اس آیت کریمہ کا حوالہ دینے کا مطلب آپ

سمجھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا تھا؟ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے باقاعدہ خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ لوگو! اس آیت کریمہ سے مغالطے میں نہ پڑنا، اس لیے کہ میں نے جناب نبی اکرمؐ سے خود سنا ہے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب خواہش پرستی اور بخل کے فتنوں کے باعث اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے، تو پھر سب سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرو۔ یعنی علیکم انفسکم کا حکم عام حالات میں نہیں ہے بلکہ فتنوں کے اس دور میں ہے جب فتنوں کی کثرت اور غلبہ کی وجہ سے خود اپنے ایمان کی حفاظت مشکل ہو جائے۔

جبکہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ اس آیت کریمہ کے حوالے سے یہی اشکال ایک صاحب نے حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے باخبر آدمی سے سوال کیا ہے اس لیے کہ مجھے بھی اس آیت پر یہی اشکال ہوا تھا اور میں نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا تو انہوں نے اس پر یہی فرمایا تھا کہ اس آیت کریمہ کا حکم فتنوں کے دور کے بارے میں ہے، اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔

اب دیکھیے کہ ایک آیت کریمہ کا مفہوم و مصداق سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کو الجھن پیش آئی اور جناب نبی اکرمؐ نے اس کی وضاحت فرما دی۔ اس قسم کی الجھنیں بیسیوں آیات کریمہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کو پیش آئی ہیں جن کی وضاحت حضورؐ نے فرمائی ہے۔ اور یہ احادیثِ نبویہ ہی ہیں جن کے ذریعے ان وضاحتوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے جو جناب نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کی مختلف آیات کے بارے میں فرمائی ہے، اور احادیثِ نبویہؐ اور روایات کے بغیر ہمارے پاس ان کا علم حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔

حلال و حرام کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی مختلف آیات کریمہ کے بارے میں غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے گئے جن کا جواب حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرامؓ نے نبی اکرمؐ سے رجوع کیا اور آپؐ نے ان کی وضاحت فرما دی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح بن مریم (التوبہ ۳۱)

”عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ اپنے احبار اور رہبان یعنی

علماء اور مشائخ کو بھی اللہ تعالیٰ کے بعد رب بنالیا تھا۔"

اس پر حضرت عدی بن حاتمؓ نے، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیحی سردار تھے، اشکال پیش کیا کہ ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا تھا، قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیا کہہ دیا ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اپنے مشائخ اور علماء کو رب کا درجہ نہیں دیا کرتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کے جواب میں ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے علماء و مشائخ کو حلال و حرام کا اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کی اتھارٹی حاصل تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اتھارٹی تو انہیں حاصل ہے۔

اور میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اتھارٹی آج بھی کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم کو حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال سمجھی جاتی ہے اور جس کو حرام کہہ دیں وہ حرام قرار پاتی ہے۔

جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ رب بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، عیسائیوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اس اختیار کا حامل قرار دے رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلام کا عقیدہ کیا ہے؟ ذرا غور کر لیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی شخصیت کو حلال و حرام میں ردوبدل کا صوابدیدی اختیار دیتا تو اس کا حق سب سے زیادہ جناب نبی اکرمؐ کا ہو سکتا تھا۔ لیکن جب حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ

یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (التحریم ۱)

"اے نبی! جو چیز ہم نے آپ کے لیے حلال کی ہے وہ آپ نے کیسے حرام قرار دے دی؟"

چنانچہ آپؐ نے حکمِ خداوندی کے تحت قسم توڑی اس کا کفارہ دیا اور شہد استعمال کیا۔

اسی طرح کا ایک اعتراض حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر ہوا جب وہ نجران کے علاقے میں دعوتِ اسلام کے لیے گئے۔ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق وہاں کے مسیحی علماء نے قرآن کریم میں سورۃ مریم کی آیت ۲۸ پر اعتراض کیا جس میں یا اخت ہارون کہہ کر حضرت مریم علیہا السلام کو ہارون کا بھائی قرار دیا گیا ہے، جبکہ حضرت ہارونؑ تو حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے اور ان کے اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور مدینہ منورہ واپسی پر یہ سوال نبی اکرمؐ کے سامنے پیش کر دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حضرت مریمؑ کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا اور وہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ نہیں تھے، بنی اسرائیل میں لوگ اپنے بچوں

کے نام انبیاء کرام علیہم السلام کے نام پر رکھا کرتے تھے۔

میں نے آپ حضرات کے سامنے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ جملوں، آیات اور سورتوں تک رسائی کی بات ہو، اس کی ترتیب کا مسئلہ ہو، مصحفِ قرآنی کی اساس، اور ماخذ کا معاملہ ہو، کسی آیت کا مفہوم سمجھنے میں الجھن درپیش ہو، یا قرآن کریم کی کسی بات پر غیر مسلموں کے کسی اعتراض کا مسئلہ ہو، ہر معاملہ میں ہم حدیثِ نبویؐ کے محتاج ہیں اور ان میں سے کوئی مسئلہ بھی حدیث نبویؐ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی پس منظر میں فرمایا ہے کہ تمام علومِ دینیہ کا سرچشمہ اور اساس حدیثِ نبویؐ کا علم ہے (۱) اسی سے ہمیں قرآن ملتا ہے (۲) اسی سے سنت حاصل ہوتی ہے (۳) اور اسی کی بنیاد پر فقہ تشکیل پاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدیثِ نبویؐ کا صحیح یقین اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مسجدِ نبوی میں افطار کا منظر

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۱ اگست ۲۰۱۲ء)

ایک مسجد نبوی میں افطار کا منظر ہے جس کا مجھے پہلی بار تفصیل کے ساتھ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ پہلے بھی کئی بار حاضری ہوئی ہے لیکن مسلسل پانچ چھ روز تک رہنے کی سعادت طویل عرصہ کے بعد ملی ہے۔ رمضان المبارک کا پہلا روزہ سعودی عرب میں جمعۃ المبارک کے دن تھا۔ میں اس روز وہیں تھا، شام کو افطار کا منظر دیکھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ مسجد نبوی کے اندر اور باہر چاروں طرف ہزاروں دستر خوان عصر کے بعد بچھ گئے اور مدینہ منورہ کے ہزاروں خاندانوں کے افراد مہمان نوازی کا جذبہ لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔

چھوٹے چھوٹے بچے مہمانوں کو گھیر کر اپنے اپنے دستر خوان پر لانے کے لیے محنت کر رہے تھے۔ ایک خاندان کے تین چار بچوں کو میں نے دیکھا کہ وہ مسجد میں آنے والوں سے چمٹ رہے تھے اور انہیں اپنے دستر خوان پر کھینچ کھینچ کر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان بچوں کی عمریں آٹھ سے چودہ سال کے درمیان ہوں گی مگر اس وقت ان سب کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے دستر خوان پر روزہ کھولیں۔ ایک لڑکے کو یہ کہتے ہوئے سن کر میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں جو مسجد میں آنے والے ایک صاحب کا دامن پکڑے ہوئے اسے کہہ رہا تھا تعال علیٰ سفرة الولد کہ آؤ بیٹے کے دستر خوان پر روزہ کھولو۔ تین چار دن مسلسل یہ منظر دیکھتا رہا اور ایمان کی بیٹری چارج کرتا رہا، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رمضان المبارک، تربیت کا مہینہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور--- ۱۵ اگست ۲۰۱۲ء)

رمضان المبارک قرآن کریم اور روزوں کا مہینہ ہے، برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہے، مغفرت اور نجات کا مہینہ ہے، جو اپنی بہاریں دکھا کر چند دنوں میں رخصت ہونے والا ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ سعادت مند جنہوں نے ان مبارک ساعات سے فیض حاصل کیا اور اپنے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ کر لیا۔

صبر اور مواخات کا احساس

اس کے ساتھ ساتھ رمضان المبارک صبر و مواخاۃ کا مہینہ بھی ہے کہ اس ماہ میں مسلمانوں کو بھوک پیاس پر صبر کر کے اپنے بھوکے پیاسے بھائیوں کی تکالیف کا احساس ہوتا ہے، اور یہ احساس ان میں بھوکوں پیاسوں کے لیے ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں ارشادات میں سوسائٹی کے غربا، مساکین اور مستحقین کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے۔ اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھو اور ضرورتمندوں کو تلاش کر کے انہیں خوشیوں میں شریک کرو۔

سائل اور محروم کا حق

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے کہ وفی اموالھم حق للسائل والمحروم جن لوگوں کو ہم نے مال و دولت سے نوازا ہے ان کے مال میں سوسائٹی کے سائل اور محروم دونوں طبقوں کا حق ہے۔ مفسرین نے بتایا کہ

- ’’سائل‘‘ اس ضرورتمند کو کہتے ہیں جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتا ہے اور ان کے لیے اپنے بھائیوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے،
- جبکہ ’’محروم‘‘ وہ شخص ہے جو ضرورتمند تو ہے مگر اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتا اور سفید پوشی

کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

مالدار کے مال میں ان دونوں کا حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کی امداد کر دینا کافی نہیں ہے جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں، بلکہ سفید پوشی کے پردے میں چھپے ہوئے ان افراد کی تلاش بھی مالدار لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اپنی ضرورت کا اظہار کرنے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں۔

حق اور احسان کا فرق

پھر قرآن کریم نے اسے ”حق“ قرار دیا ہے اور احسان کے زمرے میں شمار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ کسی ضرورتمند اور مستحق پر خرچ کر کے اسے بعد میں یاد دلانے اور اس پر احسان جتانے کو قرآن کریم نے نیکی ضائع ہو جانے کا باعث بتایا ہے۔ اسی لیے رمضان المبارک اور روزوں کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس ماہِ مبارک کے دوران انسان میں بھوک پیاس برداشت کر کے بھوکوں اور پیاسوں کی تکلیف کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور اردگرد کے ضرورتمندوں کے ساتھ تعاون کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔

سرکاری حکام اور عہدیداران کیلئے ضابطہ

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے عمّال اور سرکاری افسران و حکام پر پابندی لگا دی تھی کہ ان میں سے کوئی شخص

- ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا،
- چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا،
- باریک لباس نہیں پہنے گا،
- اور اپنے مکان کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا۔

یہ سب باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز اور تعیش کے اسباب میں شمار ہوتی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری حکام اور افسران عام سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے لوگوں کے درمیان رہیں اور انہی جیسی زندگی گزاریں، تاکہ انہیں لوگوں کے مسائل کا علم رہے اور ان کی مشکلات و تکالیف کا احساس ہو۔ ظاہر بات ہے کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف کا احساس اسی شخص کو ہو گا جس نے خود بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کی ہے۔ یا آج کی زبان میں لوڈ شیڈنگ کے عذاب کا اندازہ وہی

شخص کر سکے گا جس کے اپنے گھر میں دن اور رات کا زیادہ حصہ بجلی بند رہتی ہے۔

نبی کریمؐ کے اختیاری فقر کی حکمت

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی ہر قسم کی سہولتوں پر دسترس ہونے کے باوجود اختیاری فقر کی جو زندگی بسر کی، اس کی ایک حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرتؐ عام لوگوں کی طرح رہنے کو پسند فرماتے تھے، تاکہ ان کی تکالیف اور ضرورتوں کا علم ہوتا رہے اور ان کی مجبوریوں کا احساس موجود رہے۔ حتیٰ کہ نبی کریمؐ نے ایک موقع پر ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے بعض سہولتوں کے تقاضے پر ان سے علیحدگی اختیار کر لینے کی پیشکش بھی فرما دی تھی۔

ہمارے آج کے مسائل اور مشکلات کی سنگینی میں مسلسل اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ معاشرے کی طبقاتی تقسیم نے ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ اور سہولت و تعیش کی فراوانی نے مال و دولت کی کثرت رکھنے والے طبقات کو عام آدمی کی تکالیف اور اذیتوں سے بے خبر کر رکھا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں نماز، روزہ اور حج کی تینوں عبادتیں اس فرق کو مٹانے کا ذوق پیدا کرتی ہیں:

- نماز کسی امتیاز کے بغیر سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتی ہے،
- روزہ سب کو ایک ہی طرح بھوکا اور پیاسا رکھتا ہے،
- اور حج سب کو ایک لباس میں بیت اللہ کے گرد جمع کر کے مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی عبادات کی اس روح کو معاشرتی زندگی اور معاشی سرگرمیوں کی بنیاد بنایا جائے، اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور تکلیف و مصیبت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

غربت سمجھنے کیلئے دو امیر زادوں کا تجربہ

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ رپورٹ کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار سہ روزہ دعوت نے ۲۶ جولائی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع کی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ دو امیر زادوں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ غربت کیا ہوتی ہے چند روز تک ایک سو روپیہ یومیہ میں گزارہ کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ ان میں ایک ہریانہ کے اعلیٰ پولیس افسر کا بیٹا ہے جس نے امریکہ میں تعلیم

حاصل کی ہے، جبکہ دوسرا امریکہ میں ہی والدین کے ساتھ قیام پذیر ہے۔ ان دونوں نے چند دن کے اس تلخ تجربے کے بعد جو تاثرات بیان کیے ہیں وہ اس رپورٹ کے مطابق کچھ اس طرح ہیں:

''اب وہ اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اس ادھیڑ بن میں گزارتے تھے کہ دو وقت کے کھانے کا انتظام کس طرح کریں؟ اب ان کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہو گیا تھا، سستی غذائی اشیا کی تلاش ان کا روزمرہ معمول بن گیا تھا، بس کا سفر پانچ کلومیٹر سے زائد کا نہیں کر سکتے تھے، بجلی کا استعمال بھی بمشکل پانچ چھ گھنٹے کر پاتے تھے، اور نہانے کا صابن دونوں فرد آدھا کاٹ کر استعمال کرتے تھے۔ ان نوجوانوں کا کہنا ہے کہ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ہماری پیدائش امیر گھرانوں میں ہوئی جس کی وجہ سے ہم آرام دہ زندگی گزار سکتے ہیں، لیکن ان لوگوں کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں جو اپنے حالات کی وجہ سے سخت جدوجہد کرنے پر مجبور ہیں، ان سوالات کے جوابات تو ہمیں نہیں معلوم لیکن اب ہم اتنا ضرور جان گئے ہیں کہ غربت کے معنیٰ کیا ہوتے ہیں؟''

غربت ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے ہر دور میں کوششیں ہوتی رہتی ہیں لیکن کاغذی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو طبقات غربت کو کم کرنے کی پالیسیاں بناتے ہیں انہیں خود پتہ نہیں کہ غربت کیا ہوتی ہے اور غریب کے شب و روز کس کرب میں گزرتے ہیں۔ وہ غربت کو بھی اعداد و شمار کا ہی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اعداد و شمار کے الٹ پھیر سے لیپا پوتی کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ رمضان المبارک رحمتوں کا مہینہ ہے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کم از کم کچھ لوگوں کو اندازہ تو ہو جائے کہ بھوک اور پیاس کیا ہوتی ہے اور بھوکوں اور پیاسوں پر کیا گزرتی ہے۔

”عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین“

(جامع مسجد نور ملحقہ جامعہ نصرۃ العلوم، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ میں
عید الفطر ۱۴۳۳ھ (۲۰۱۲ء) کے اجتماع سے خطاب)

مسلمانوں کی عیدیں

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج عید کا دن ہے جو رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور دیگر عبادات کی توفیق ملنے پر شکرانے کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمتوں اور برکتوں کا یہ مہینہ زندگی میں ایک بار پھر نصیب فرمایا ہے اور تھوڑی بہت عبادات کی توفیق بھی دی ہے جس پر ہم آج عید کا دن منا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ٹوٹی پھوٹی عبادات کو قبول فرمائیں اور صحت و عافیت اور توفیقِ عمل کے ساتھ زندگی میں ایسے رمضان اور عیدیں بار بار عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

دنیا کی ہر قوم میں عید کا کوئی نہ کوئی دن ہوتا ہے جس دن قوم اجتماعی طور پر خوشی کا اظہار کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے لوگ خوشی مناتے ہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں دو عیدیں دی ہیں۔ ایک رمضان المبارک کی تکمیل کی خوشی میں عید الفطر، اور دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کی یاد میں عید الاضحیٰ۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو عیدوں کا اعلان فرمایا اور خود بھی یہ عیدیں منائیں، اس لیے اس دن کو خوشی کے دن کے طور پر منانا سنتِ نبویؐ ہے۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں مختلف اقوام کی بعض عیدوں کا ذکر ہے جن کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل کی عیدیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نبی بنا کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف یہ دعوت اور مشن دے کر بھیجا کہ فرعون کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ بتائیں، اور اس سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کریں جو کئی سالوں سے فرعون اور اس کے خاندان کے غلام چلے آرہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ان پیغمبروں نے فرعون کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی

دعوت دینے کے بعد عصا اور یدِ بیضاء کے دو معجزے اپنی صداقت کے اظہار کیلئے دکھائے تو فرعون نے اسے جادو قرار دیا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں جادوگر اکٹھے کر کے مقابلہ کی دعوت دی۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ مقابلہ یوم الزینۃ (طہ ۵۹) یعنی ان کی عید کے دن ہوا تھا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے جادوگروں پر واضح فتح دی تھی جس کے نتیجے میں وہ جادوگر ایمان لے آئے تھے۔

اسی طرح قرآن کریم نے سورہ المائدہ میں ذکر کیا ہے کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ وہ ہم پر آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا دستر خوان اتاریں۔ حضرت عیسیٰؑ نے پہلے توڈانٹا اور قال اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین (المائدہ ۱۱۲) کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ مگر پھر حواریوں کے اصرار پر اللہ تعالیٰ سے دعا کر دی کہ یا اللہ! ان پر آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا دستر خوان نازل فرمادے، وہ ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے "عید" کا دن ہوگا اور آپ کی قدرت کی نشانی ہوگا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ دستر خوان کئی روز تک اترتا رہا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یہ وعید تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس کی ناشکری کی تو فانی اعذبہ عذابًا لا اعذبہ احدًا من العالمین (المائدہ ۱۱۵) میں اسے ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کی ناشکری عذاب کا باعث ہوتی ہے، لیکن جو نعمت خود مانگ کر لی جائے اس کی ناشکری پر عذاب بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر پابندی تھی کہ دستر خوان پر خود کھا سکتے ہو لیکن ذخیرہ کر کے گھر نہیں لے جاسکتے، مگر انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی جس پر انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔

دس محرم کے روزہ کا پس منظر

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورؐ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے یہودیوں کو دیکھا کہ وہ دس محرم (عاشورا) کا روزہ رکھتے ہیں۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعون کے جبر اور غلامی سے نجات ملی تھی، فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں آزادی حاصل کر لی تھی۔ آپؐ نے فرمایا نحن احق بموسیٰ منکم کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہمارا تعلق اور حق تم سے زیادہ ہے، اس لیے ہم

بھی اس دن روزہ رکھا کریں گے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورا کا روزہ فرض تھا، بعد میں اس کی حیثیت نفلی روزے کی ہوگئی۔ جبکہ آخری سال جناب نبی اکرمؐ نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ یہودیوں کے ساتھ عبادت میں فرق قائم رکھنے کے لیے وہ اگلے سال اس کے ساتھ ایک روزہ زائد رکھیں گے، مگر اگلے سال سے قبل آنحضرتؐ وفات پا گئے۔

ایک یہودی عالم کا استفسار اور حضرت عمرؓ کا جواب

بخاری شریف ہی کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی عالم نے کہا کہ قرآن کریم میں ایک آیت ایسی ہے اگر وہ ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو عید بنا لیتے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا
(المائدہ ۳)

”آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے تین باتیں فرمائی ہیں:

1. ایک یہ کہ میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے کہ جو وحی اور دین حضرت آدم علیہ السلام سے نازل ہونا شروع ہوا تھا وہ حضرت محمدؐ پر قرآن کریم کی صورت میں مکمل ہو گیا ہے اور اب کسی نئی وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔
2. دوسری بات یہ فرمائی کہ دین ہی اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے جو تمام ہو گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان عظیم ہے کہ جناب رسول اللہؐ جیسی جامع شخصیت اور قرآن کریم جیسی مکمل کتاب تمہیں عطا فرمائی ہے۔
3. اور تیسری بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اسی دین پر راضی ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۱۹) کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین یعنی انسانوں کے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ صرف اسلام ہے۔ جبکہ ایک اور جگہ یہ بات یوں بیان فرمائی ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین یا ضابطۂ حیات تلاش کرے گا فلن یقبل

منہ (آل عمران ۸۵) اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کی آیت ہے جس کے بارے میں یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارا وہ عید کا دن ہی تھا جس روز یہ آیت کریم نازل ہوئی تھی اور میں اس کا گواہ ہوں۔ وہ عرفہ کا دن تھا اور جمعہ کا دن بھی تھا۔ اس لیے جس روز یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وہ ہمارے لیے دوہری عید کا دن تھا۔

عید کے حوالے سے قرآن و حدیث میں ان چند ایام کا ذکر ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں اور ہمارے لیے ان سب میں سبق موجود ہے۔

عید کا معنیٰ حضرت علیؓ کی نظر میں

عید کا مفہوم اور مقصد کیا ہے؟ اس حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ارشاد گرامی ہے کہ کل یوم لا یعصی اللہ فیہ عزوجل فھو لنا عید۔ ہر وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بغیر گزر جائے وہ ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ یعنی مسلمان کی اصل عید یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اس کی رضا کا حقدار قرار پائے۔ ایک انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اسے ہدایت مل جائے اور وہ دوزخ سے بچ کر جنت میں چلا جائے، اور ایسا اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مسلمان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ حتیٰ کہ جنت میں داخل ہونے والوں کو بھی ساری نعمتیں مل جانے کے بعد جو سب سے بڑی اور آخری نعمت ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی جسے ورضوان من اللہ اکبر (التوبہ ۷۲) کہا گیا ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ عید کا مفہوم و مقصد یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انسان محفوظ رہے اور اس کی رضا کا مستحق ٹھہرے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور علامہ محمد اقبالؒ

میں اس بارے میں ایک بات علامہ اقبالؒ کے حوالے سے بھی کرنا چاہوں گا، اس لیے کہ امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ایک عجیب ارشاد میں نے کسی جگہ پڑھا ہے، وہ فرماتے تھے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہیے، اگر وہ سید احمد شہیدؒ کی طرح نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم علامہ اقبالؒ کی طرح ہی پڑھ لیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے عید کے بارے میں کہا ہے کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دین

کہ آزاد قوموں کی عید تب ہوتی ہے جب ملک باوقار ہو اور دین سربلند ہو۔ آج ہمارا دین کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور ہمارے ملک کی کیا حالت ہے؟ ہماری اصل عید تو اس دن ہوگی جب ملک کو حقیقی آزادی حاصل ہوگی، قوم خود مختار ہوگی، دین سربلند ہوگا، اور ہم اپنے دین کے نفاذ اور سربلندی کے لیے سرگرمِ عمل ہوں گے۔ اس لیے کہ غلاموں اور مجبوروں کی عید بھی کیا عید ہوتی ہے؟

آئیے مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی عید نصیب فرمائیں، ملکی آزادی، قومی خود مختاری اور دین کی سربلندی کی منزل سے ہمکنار کریں۔ اور ہماری رمضان المبارک کی عبادات کو قبول فرماتے ہوئے آئندہ بھی خلوص اور ذوق کے ساتھ عبادت کی توفیق دیتے رہیں، آمین یارب العالمین۔

رمضان المبارک اور قرآن کریم

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۳۰ جون ۲۰۱۴ء)

لیلۃ القدر کا مہینہ

عالمِ اسلام میں رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان عبادات کے نئے ذوق و شوق کے ساتھ رمضان المبارک کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے۔ اور اسی میں "لیلۃ القدر" بھی ہے، اس رات کو ایک مہینے سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا نزول اسی ماہ میں ہوا، جو اگرچہ عملاً جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مسلسل ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا مگر لوحِ محفوظ سے آسمانی دنیا تک منتقل کرنے کا حکم اس رات میں دیا گیا جس کی وجہ سے یہ رات خصوصی اعزاز سے نوازی گئی۔

قرآن کریم اور رمضان المبارک کا تعلق

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو نسلِ انسانی کی راہنمائی کے لیے نازل ہوا اور قیامت تک اولادِ آدمؑ کو ہدایت و نجات کی راہ دکھاتا رہے گا۔ قرآن کریم اور رمضان المبارک کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں جس کی وجہ سے اس مہینہ میں قرآن کریم سب سے زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ شاید سارے سال میں قرآن کریم اتنی بار اور اس ذوق و شوق کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا جتنا اس ماہِ مبارک میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اگر دنیا بھر میں سروے کر کے رمضان المبارک میں تلاوت کیے جانے والے قرآن کریم کی مقدار اور تعداد کو شمار کیا جائے تو کسی بڑے سے بڑے منظم ادارے کے لیے بھی یہ کام بہت مشکل ثابت ہو گا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز اور اعزاز ہے جس میں دنیا کے کسی مذہب، کسی زبان اور کسی موضوع کی کوئی کتاب اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اور رمضان المبارک قرآن کریم کے اس اعجاز اور اعزاز کے اظہار کا سالانہ سیزن ہوتا ہے۔

فیصلوں کی کتاب

گزشتہ روز نوشہرہ سانسی گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی محمد عیسی خان گورمانی کی مسجد میں نمازِ عصر کے بعد اس موضوع پر گفتگو کا موقع ملا تو ذہن کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ یہ بھی تو قرآن کریم کے اعجاز کا ایک پہلو ہے کہ دنیا بھر کی لاکھوں مساجد میں تراویح کے دوران روزانہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے، اور ہر رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے قاری و حافظ اللہ تعالیٰ کا یہ پاک کلام نماز کی حالت میں مسلمانوں کو سناتے ہیں، مگر کہیں بھی اس بات کا شبہ بلکہ اس کا امکان تک نہیں ہوتا کہ کہیں یہ حافظ صاحب دوسرے حضرات سے مختلف قرآن کریم نہ پڑھ رہے ہوں۔ مراکش کا حافظ جکارتہ میں قرآن کریم سنا رہا ہو، کوالالمپور کا حافظ نیروبی میں پڑھ رہا ہو، ماسکو کا حافظ کیپ ٹاؤن میں پڑھ رہا ہو، لندن کا حافظ برلن میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا ہو، یا ہانگ کانگ کا حافظ پیرس میں قرآن کریم سنانے میں مصروف ہو، کہیں بھی ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوتا کہ کہیں اس کا قرآن کریم دوسرے سے مختلف نہ ہو۔ پورے اعتماد کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سنا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں قرآن کریم ایک ہی ہے۔ لہجے اور قراءت کا اختلاف تو مسلّم ہے لیکن قرآن کریم کے متن، ترتیب اور جملوں میں کہیں کوئی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ یہ حفاظ کرام دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

قراءت وسماعت کے نظام کی حکمت

کئی سال قبل ایک امریکی ادارے کے سروے میں دنیا میں حافظوں کی تعداد تیرہ ملین کے لگ بھگ بتائی گئی تھی۔ اب اگر اس سے ڈبل نہیں تو اس کے قریب ضرور ہو گی۔ اور دنیا کا کوئی علاقہ ان حفاظ کرام کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں کوئی ادارہ قرآن کریم کا نعوذ باللہ غلط نسخہ چھاپ دے، یا آیات، سورتوں اور جملوں میں ردوبدل کر دے، تو اس نسخے کو چیک کرنے کے لیے مدینہ منورہ یا کسی اور شہر بھجوانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اسی علاقے میں دو چار حافظ موجود ہوں گے جو پڑھ کر بتا دیں گے کہ اس میں یہ جملہ غلط ہے، یہ آیت درست نہیں ہے، اور یہ ترتیب اصل قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن کریم کو اس طرح یاد کرنے، رٹنے رٹانے، سننے سنانے، اور بار بار دہرانے کا یہ عمل قرآن کریم کی حفاظت کا ایسا فول پروف سسٹم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے قرآن کریم میں کسی طرح کے ردوبدل کا سرے سے کوئی

امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اور خود قرآن کریم نے یہ بات چیلنج کے انداز میں بیان کی ہے لا یأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه کہ باطل کو قرآن کریم میں در اندازی کا کہیں سے کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

قرآن کریم کے کتابی نسخے

چنانچہ بہت دفعہ کوشش کی گئی مگر قرآن کریم جوں کا توں ایک ہی حالت میں دنیا میں ہر جگہ موجود ہے، یہ قرآن کریم کے حفظ کا اعجاز و کمال ہے۔ قرآن کریم کے کتابی نسخوں کا بھی ایک کمال دیکھ لیجئے کہ قرآن کریم کے جو اولین نسخے حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں لکھوائے گئے تھے، ان میں سے دو تین اصلی نسخے استنبول، تاشقند اور لندن میں موجود ہیں۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں حضرت مولانا سید نفیس الحسینی شاہؒ کے ہمراہ حاضری کے موقع پر وہاں کا نسخہ میں نے دیکھا ہے۔ میں وہ نسخہ ہاتھوں میں اٹھائے دل میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی دیکھیے کہ قرآن کریم کے اصل نسخے کی حفاظت کس جگہ اور کن لوگوں کے ہاتھوں کروا رہا ہے۔ اور صرف حفاظت نہیں بلکہ اس کے اوریجنل ہونے کی گارنٹی بھی انہی سے دلوا رہا ہے کہ جس جگہ یہ مبارک نسخہ رکھا ہوا ہے وہاں یہ تحریر موجود ہے کہ یہ قرآن کریم کا وہ اصل نسخہ ہے جو مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے دور میں لکھا گیا تھا اور ان مستند ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے۔

قرآن کریم کا ’’جادو‘‘

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا صرف ایک پہلو ہے۔ اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ مشرکینِ عرب نے قرآن کریم کے مقابلے سے عاجز ہو کر اسے ’’جادو‘‘ قرار دیا تھا۔ جس کی قرآن کریم نے تردید کی ہے کہ نہ میں جادو ہوں اور نہ ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہیں۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم جادو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ البتہ محاورہ کی زبان میں یہ کہنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ

’’قرآن کریم جادو نہیں ہے لیکن اس کا جادو آج بھی دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے‘‘۔

دین میں عُسر اور یُسر کا مفہوم

(۲۲ جولائی ۲۰۱۴ء کو جامع مسجد صدیقیہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ قرآن کریم کی جس آیت کریمہ میں ماہِ رمضان میں قرآن کریم کے نزول اور روزے کی فرضیت کا تذکرہ ہے، اور مسافر و مریض کے لیے روزہ دوسرے دنوں میں قضا کر لینے کی سہولت بیان کی گئی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرہ ۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتے۔ آج قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یُسر اور عُسر کا مفہوم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے شریعت کے احکام میں تنگی اور آسانی کی کون سی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

روزہ میں سہولتیں

پہلی بات تو روزے کے حوالے سے دیکھ لیں کہ روزے پہلی امتوں پر بھی فرض تھے اور ہم پر بھی فرض کیے گئے ہیں، لیکن ہمارے لیے دو بڑی سہولتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے:

قضا اور فدیہ کی سہولت

ایک یہ کہ روزہ فرض ہے جو ہر حال میں رکھنا ہے لیکن اگر بیماری اور سفر کی وجہ سے روزے میں دشواری پیش آ رہی ہے تو اجازت دی گئی ہے کہ اس وقت روزہ نہ رکھیں اور بعد میں مناسب ایام میں قضا کر لیں۔ جبکہ اگر بڑھاپے اور بیماری کی نوعیت ایسی ہے کہ بعد میں بھی قضا نہیں ہو سکتی تو فدیہ دے دیں۔

یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ روزہ رمضان المبارک میں نہ رکھ سکنے کی صورت میں فدیہ دیا جاتا ہے اور بعض لوگ معمولی بیماری پر بھی فدیہ دے کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ فدیہ روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ قضا نہ کر سکنے کی صورت میں ہے۔ جو شخص رمضان المبارک میں روزہ نہیں رکھ سکتا مگر بعد میں قضا کر سکتا ہے اس کے لیے فدیہ نہیں بلکہ قضا ہے۔ البتہ جو بعد میں قضا بھی نہیں کر سکتا اس کے

لیے فدیہ کی سہولت ہے۔ حتیٰ کہ فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ اگر یہ سمجھ کر فدیہ دے دیا کہ رمضان المبارک میں روزہ نہیں رکھ سکتا اور بعد میں قضا بھی اس کی استطاعت میں نہیں ہے، مگر بعد میں کسی وقت قضا کرنے کی استطاعت ہوگئی تو قضا ضروری ہو جائے گی اور دیا گیا فدیہ صدقہ شمار ہوگا۔

یہ روزے میں ایک بڑی سہولت ہے جو دو مرحلوں میں دی گئی ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تو بعد میں قضا کرنے، اور دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر بعد میں قضا بھی نہیں کر سکتا تو فدیہ دے دے۔

سحری اور افطار کی سہولت

روزہ میں دوسری سہولت ہمیں یہ دی گئی ہے کہ پہلی امتوں کا روزہ دن رات کا ہوتا تھا جو رات سونے سے شروع ہو جاتا تھا اور اگلے روز شام تک جاری رہتا تھا، سحری اس میں نہیں ہوتی تھی۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کا دورانیہ کم کر دیا اور رات اس سے نکال کر سحری کھانے کو سنت قرار دے دیا۔ اور اس کی وجہ ہماری ایک کمزوری بیان کی کہ علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم (البقرہ ۱۸۷) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کرتے ہو۔ وہ یہ کہ روزے میں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کی مباشرت بھی منع ہے لیکن کچھ لوگوں سے رات کو اس سے صبر نہیں ہوتا تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے خیانت سے تعبیر کر کے فرمایا ہے کہ وعفا عنکم پچھلی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی ہیں اور آئندہ کے لیے رات کو روزے سے نکال دیا ہے، اب روزہ طلوعِ فجر سے شروع ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔

یہ دو بڑی سہولتیں اللہ تعالیٰ نے روزے میں ہماری امت کو دی ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارے لیے سہولت اور یُسر کا راستہ بتاتا ہے اور تمہیں تنگی اور عُسر میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔

نماز اور طہارت میں سہولت

اللہ تعالیٰ کا عمومی ضابطہ یہ ہے کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (البقرہ ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام نہیں لگاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی حکم جو کسی انسان کی طاقت میں نہ ہو، شریعت میں اس سے اس کا تقاضہ نہیں کیا گیا۔ اور اگر کوئی کام اس کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے تو اس کے مطابق اسے سہولت دے دی گئی ہے، جیسا کہ نماز کے بارے میں ہے کہ

- مسجد میں پڑھو، لیکن اگر کوئی عذر ہو تو گھر میں یا جہاں بھی ہو پڑھ لو۔
- کھڑے ہو کر پڑھو، اگر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو، اگر حرکت بھی نہیں کر سکتے تو اشاروں سے پڑھ لو۔
- نماز کے لیے طہارت ضروری ہے، اگر پانی میسر نہیں ہے یا پانی کے استعمال پر کسی وجہ سے قدرت نہیں ہے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔

جبکہ روزے کے بارے میں مرحلہ وار سہولت کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، یہ سب سہولتیں انسانی طاقت اور ہمت کے حوالے سے ہیں اور ان کا مقصد ہر مسلمان کو شرعی فریضہ کی ادائیگی میں آسانی مہیا کرنا ہے اور اس کی طاقت و ہمت کے مطابق اس سے کام لینا ہے۔

آسانی کی تعیین شریعت کی طرف سے

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ انسان کے بس میں کون سا کام ہے اور کون سا نہیں ہے، اس کا فیصلہ کرنا کام کرنے والے پر نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ انسانی نفسیات عام طور پر یہ ہیں کہ اگر اس سے کہہ دیا جائے کہ یہ کام اگر تم سہولت سے کر سکتے ہو تو کر لو، اور اگر سہولت نہ محسوس کرو تو نہ کرو، تو پھر صرف دین کے احکام نہیں بلکہ دنیا کے کام بھی اکثر رک جائیں گے اور کوئی کام بھی نہیں ہو سکے گا۔ انسان فطرتاً سہل انگار ہے، اس لیے یہ فیصلہ کرنا کام کرنے والے کا اختیار نہیں ہے بلکہ شریعت نے خود ہی جہاں تنگی محسوس کی ہے وہاں سہولت دے دی ہے، اس لیے کہ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون سا کام کر سکتا ہے اور کونسا کام نہیں کر سکتا۔

ہمارے ہاں کوئی مشین ہے جس کے بارے میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون سے کام کر سکتی ہے اور کون سا کام اس کے بس میں نہیں ہے، اس بات کا فیصلہ ہم مشین بنانے والی فرم سے پوچھ کر کرتے ہیں کہ بنانے والی فرم ہی بہتر جانتی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی مشین سے کون سا کام لیا جا سکتا ہے اور کونسا کام وہ مشین نہیں کر سکتی۔ اسی طرح انسانی طاقت اور صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں اور انہوں نے اسی کے مطابق شریعت کے احکام و ضوابط مقرر فرمائے ہیں۔

سائنسی ترقی کے ساتھ انسان کی تن آسانی

اس طرح عُسر اور یُسر کا ایک دائرہ یہ بھی ہے کہ جوں جوں انسانی صلاحیتوں اور قوت میں کمزوری

آتی گئی ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں کے احکام آسان ہوتے چلے گئے ہیں۔ اور آخری امت کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے معاملات میں ایسی آسانیاں فراہم کی ہیں جو پہلی امتوں کو حاصل نہیں تھیں، جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ان میں شامل ہیں کہ پہلے غنیمت کا مال استعمال کرنا جائز نہیں تھا، اب اسے حلال و طیب کر دیا گیا ہے۔ پہلے قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بعد میدان میں ڈال دیا جاتا تھا اور آسمان سے آگ آکر اسے جلا دیتی تھی، اب قربانی کا گوشت کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اس طرح کی بہت سی سہولتیں ہیں جو ہماری امت کو مرحمت فرمائی گئی ہیں۔

یہاں ایک اور بات قابلِ توجہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کو جوں جوں اسباب اور وسائل کی فراوانی کی سہولت ملتی جا رہی ہے اس کی ذاتی قوت و صلاحیت کمزور ہوتی جا رہی ہے، مثلاً

- جب سواری عام میسر نہیں تھی لوگ میل ہا میل پیدل سفر کر لیتے تھے، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔
- پہلے حکیم نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری اور اس کا سبب بیان کر دیتا تھا، اب معمولی بیماریوں کے تعین کے لیے ڈاکٹر صاحبان کو مختلف مشینوں کی رپورٹوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔
- ہمارے بچپن تک لوگ دیے، موم بتی، لالٹین اور لیمپ کی روشنی میں لکھ پڑھ لیا کرتے تھے، اب کمرے میں ایک بلب یا ٹیوب کو لکھنے پڑھنے کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا وغیر ذٰلک۔

جوں جوں سائنسی ترقی بڑھ رہی ہے اور اسباب و وسائل کی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اسی حساب سے انسان کی ذاتی صلاحیتوں میں کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح ہم آج کے لوگ اسباب و وسائل کے حساب سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں، جبکہ پہلے لوگ ذاتی استعداد اور صلاحیتوں کے حوالے سے ہم سے کہیں زیادہ قوت و طاقت رکھتے تھے۔ گزشتہ شریعتوں کے احکام کے تسلسل میں جو سہولتیں فراہم کی جاتی رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ پر وحی کا سلسلہ مکمل اور نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد اب شریعت کے اصولی احکام مکمل ہو گئے ہیں اور منصوص احکام میں بنیادی تبدیلی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ البتہ احکام کی بجا آوری میں انسان کی ہمت و استطاعت کا لحاظ آج بھی موجود ہے، اور فقہاء کرام ہر دور میں شریعت کے اصول و ضوابط کے دائرے میں اس حوالے سے سہولتیں بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔

اجتہاد کی شرعی حدود اور آج کے تقاضے

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے علماء کرام سے

مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ''اجتہاد'' سے کام لے کر ان کے لیے سہولتیں پیدا کریں۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت میں اجتہاد کی گنجائش بلکہ حکم موجود ہے، لیکن اجتہاد کا معنٰی یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام اور فقہی اصولوں کی روشنی میں مسائل و مشکلات کا حل نکالا جائے۔ اور ایسا وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو علم و دیانت کے حوالے سے اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جبکہ اجتہاد کا مطالبہ کرنے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ نہیں ہے، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم اور ان کی کونسل کو مذہبی احکام میں ردوبدل کے صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں، اسی طرح شاید مسلمان علماء کے پاس بھی کوئی اختیار ہے جسے وہ استعمال نہیں کر رہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جسے دور کرنا چاہیے۔ فقہاء اسلام کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور وہ آج بھی اس کی حدود میں یہ عمل جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن وہ شریعت کی روشنی میں اور اصول و ضوابط کے دائرے میں کوئی سہولت بنتی ہو تو اسے بتا دیتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی سہولت پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ بتاتے ہیں، بناتے نہیں ہیں۔

ہماری فقہی تاریخ گواہ ہے کہ فقہاء کرام نے ہر دور میں اس وقت کی ضروریات اور عرف و تعامل کی روشنی میں مسائل کی تشریح کی ہے اور سینکڑوں مسائل میں سہولت دی ہے۔ خاص طور پر عرف و تعامل کے تغیر، عمومِ بلویٰ، اور مصلحتِ عامہ کے اصولوں کے تحت جہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی فقہاء اسلام نے انسانی سوسائٹی کو جائز سہولت فراہم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں بہرحال ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس سہولت کا فیصلہ کرنے والے حضرات اس فقہی مقام و صلاحیت کے حامل ہوں جو اس کے لیے ضروری ہے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ سہولت کسی مسلّمہ شرعی اصول سے متصادم نہ ہو۔

دین آسانی دیتا ہے فرار نہیں

اس کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ تعالٰی یُسر کا ارادہ فرماتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ الدین یُسر دین آسانی دیتا ہے۔ لیکن آسانی کا مطلب احکامِ شریعت سے فرار نہیں بلکہ ان کی بجا آوری میں ضرورت کے مطابق سہولت مہیا کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص یُسر کے نام پر دینی احکام پر عمل سے ہی بچنا چاہتا ہے تو اس کا نام فرار ہے یُسر نہیں ہے۔ یُسر کا معنٰی یہ ہے کہ ایک شخص شرعی حکم پر عمل کرنا چاہتا ہے لیکن عمل میں کوئی دشواری محسوس کر رہا ہے تو شریعت اس کی ہمت اور دشواری دونوں کو دیکھ کر ضرورت کے مطابق آسانی ضرور فراہم کرتی ہے، اللہ تعالٰی ہمیں احکام شریعت پر صدقِ دل کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

کیا قرآن کریم صرف پڑھ لینا کافی ہے؟

(۳۰ مئی ۲۰۱۶ء کو جامعہ محمودیہ، بٹرانوالی، گوجرانوالہ میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ چھ بچوں نے آج قرآن کریم کا آخری سبق سنایا ہے اور وہ حفاظ کرام کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ آج ان کی دستار بندی بھی کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں قرآن کریم یاد رکھنے کی توفیق دیں اور علم و خدمت کے مواقع نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ ان بچوں نے قرآن کریم حفظ کیا ہے اور صحیح تلفظ کے ساتھ تجوید کے مطابق قرآن کریم پڑھا ہے۔ ہم سب بحمد اللہ تعالیٰ قرآن کریم کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں، اور اب رمضان المبارک قریب آرہا ہے، اس میں قرآن کریم کا پڑھنا سننا ہر طرف عام ہوگا کہ یہ قرآن کریم کا سیزن ہے اور قرآنی برکات کی بہار ہے جس میں ہر مسلمان کچھ نہ کچھ پڑھنے سننے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔

درست تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی اہمیت

اس حوالے سے میں ایک سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ کیا قرآن کریم صرف پڑھ لینا کافی ہے کہ جیسے کیسے پڑھ سکے پڑھ لیا؟ یا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے؟ کسی بھی زبان میں اس کے الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ نہ پڑھے جائیں تو اس کا معنیٰ بدل جاتا ہے، بلکہ بعض دفعہ معنیٰ بگڑ بھی جاتا ہے۔ ہم اردو کا کوئی لفظ اگر غلط بول دیں تو ٹوک دیا جاتا ہے کہ یہ لفظ اس طرح نہیں ہے اسے یوں پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح انگریزی کا کوئی لفظ صحیح طور پر نہ بولا جائے تو اس پر ٹوک دیا جاتا ہے اور صحیح تلفظ بتایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی لفظ صحیح طریقہ سے نہ پڑھا جائے تو معنیٰ بدل جاتا ہے۔ اور اگر یہ معنیٰ قرآن کریم میں بدلے تو اس کی سنگینی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کسی لفظ کا کوئی حرف صحیح ادا نہ کیا جائے، یا کسی لفظ میں کوئی حرف تیزی یا بے پروائی کی وجہ سے پورا نہ پڑھا جائے، دونوں صورتوں میں معنیٰ مختلف ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک لفظ کا ذکر کروں گا۔ سورۃ الفاتحہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورۃ ہے، اس میں ایک لفظ ہے انعمت علیھم کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ لیکن عام طور پر تیزی سے یہ لفظ انمت پڑھا جاتا ہے اور جلدی میں عین کا

حرف پڑھنے سننے میں نہیں آتا۔ اس صورت میں ظاہری معنٰی یہ بن جاتا ہے کہ ”جن لوگوں پر تو نے نیند طاری کر دی“۔ یوں آیت کا مفہوم بالکل بدل کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ہمارے ذہنوں میں موجود رہنا چاہیے کہ قرآن کریم کا صرف پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ صحیح تلفظ کے ساتھ اور آرام کے ساتھ پڑھنا بھی ضروری ہے تاکہ معنٰی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ اور یہ ہر مسلمان کے لیے خواہ وہ مرد ہو، عورت ہو، بوڑھا ہو، جوان ہو، یکساں طور پر ضروری ہے۔

پانچ نمازوں کیلئے کتنا قرآن کریم یاد کرنا ضروری ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ان بچوں نے تو قرآن کریم مکمل یاد کیا ہے جو بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ دنیا میں بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت قرآن کریم کے کروڑوں حفاظ موجود ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کا اعجاز ہے، لیکن ہر مسلمان کو کچھ نہ کچھ قرآن کریم یاد ہونا ضروری ہے۔ ہمیں اس کا تھوڑا سا اندازہ کر لینا چاہیے کہ ہر مسلمان مرد، عورت، بوڑھے، بچے کو کم سے کم کتنا قرآن کریم یاد کرنا ضروری ہے؟ صرف ایک بات پر غور کر لیں کہ پانچ وقت کی نماز ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان پانچ نمازوں کی رکعتوں کو شمار کر لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کتنی رکعتوں میں قرآن کریم پڑھنا لازمی ہے؟ اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کیا ہے؟

نبی کریمؐ کی سنتِ مبارکہ یہ ہے کہ آپؐ تمام نمازوں میں سورتیں بدل بدل کر پڑھتے تھے۔ بڑی سورتیں بھی پڑھتے تھے، درمیانی بھی پڑھتے تھے، اور چھوٹی سورتیں بھی تلاوت کرتے تھے۔ کسی وقت تنہا بیٹھ کر ہر مسلمان کو ضرور حساب کر لینا چاہیے کہ وہ اگر حضورؐ کی سنت کے مطابق نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اسے چھوٹی بڑی کتنی سورتیں زبانی یاد ہونی چاہئیں۔ کیونکہ زبانی یاد ہوں گی تبھی نماز میں پڑھ سکے گا۔ ہم نے عام طور پر یہ معمول بنا رکھا ہے کہ دو چار چھوٹی سورتیں یاد کر لیتے ہیں اور ہر نماز میں انہی کو بار بار پڑھتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے نماز تو بہرحال ہو جاتی ہے لیکن یہ یاد رکھیں کہ سنت کے مطابق نہیں ہوتی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ہر مسلمان کو کم سے کم آخری پارہ تو ضرور زبانی یاد ہونا چاہیے، تب وہ سنت کے مطابق پانچ نمازیں روزانہ ادا کر سکے گا۔

اس لیے جس طرح ہمارے بچے قرآن کریم یاد کرتے ہیں، ہمیں خود بھی کچھ نہ کچھ ضرور یاد کرنا چاہیے، اور صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی کسی استاذ سے مشق کرنی چاہیے۔ یہ قرآن کریم کا حق ہے اور ہم سب کی دینی ذمہ داریوں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

نمازِ تراویح پر شکوک و شبہات کیوں؟

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۱۳ جون ۲۰۱۶ء)

ایک اخباری خبر کے مطابق یمن میں حوثیوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں نماز تراویح کی ادائیگی پر پابندی لگادی ہے۔ اور اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے والے بہت سے ائمہ مساجد کو اس بنا پر گرفتار کرلیا ہے کہ انہوں نے اپنی مساجد میں نماز تراویح باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرلیا تھا۔

حضرت عمرؓ کا اجتہاد اور صحابہ کرامؓ کا اجماع

مساجد میں رمضان المبارک کے دوران عشاء کی نماز کے بعد باجماعت نماز تراویح کا آغاز امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا جو آج تک دنیا بھر میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس سے قبل تراویح فرداً فرداً پڑھی جاتی تھیں، حضرات صحابہ کرامؓ اپنے اپنے ذوق کے مطابق اکیلے اکیلے، یا مختلف ٹولیوں کی صورت میں یہ نماز پڑھتے تھے۔ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے اجتہادی فیصلوں میں سے ہے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے طے کیا کہ مسجد نبویؐ میں نماز تراویح باجماعت پڑھی جائے گی اور سب لوگ اکٹھے ایک ہی امام کے پیچھے پڑھیں گے۔ حضرت ابی بن کعبؓ اس دور میں سب سے بڑے قاری تھے جنہیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے أقرأ کا خطاب دیا تھا کہ یہ میرے ساتھیوں میں سب سے اچھا قاری ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہی کو حکم دیا کہ وہ بیس تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائیں اور رمضان المبارک کے دوران کم از کم ایک بار قرآن کریم ضرور سنا دیں۔ یہ خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کا حکم تھا جس پر سب صحابہ کرامؓ نے اتفاق کرلیا اور ان کے اجماع و اتفاق سے اسے سنت کا درجہ حاصل ہوگیا۔

چنانچہ تب سے یہ کارِ خیر جاری ہے اور دنیا کے ہر حصے میں مسلمان اس سنت کی ادائیگی کا ہر سال اہتمام کرتے ہیں۔ جس سے لاکھوں حفاظ قرآن کو کلام پاک سنانے اور کروڑوں مسلمانوں کو حالتِ نماز میں قرآن کریم سننے کی سعادت حاصل ہوجاتی ہے۔ حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ سمیت دنیا بھر میں تراویح مجموعی طور پر بیس رکعت کی تعداد میں ہی پڑھی جاتی ہیں، البتہ بعض حلقوں میں بیس کی بجائے

آٹھ رکعتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مگر تراویح باجماعت پڑھنے، پورے رمضان میں روزانہ ادا کرنے، اور اس میں قرآن کریم سنانے کا اہتمام ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تعداد کے اختلاف کے سوا نماز تراویح کی دیگر کیفیات میں وہ بھی جمہور امت کے ساتھ متفق ہیں اور یوں تراویح کی ادائیگی اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام حلقوں میں متفقہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تراویح کی آٹھ اور بارہ رکعت کا معاملہ

آٹھ اور بیس رکعت تراویح کے اختلاف پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ چند سال قبل سپرنگ فیلڈ، ورجینیا (امریکہ) کے دینی مرکز دارالہدیٰ میں نماز تراویح کے آغاز پر میں بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے اچانک سوال کر دیا کہ ”کیا آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی تراویح ہو جاتی ہیں؟“ اس قسم کے سوالات عمومی مجمع میں عام طور پر مسلکی چھیڑ چھاڑ کے لیے کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان صاحب کو ایک سادہ سا جواب دیا کہ ”ہاں آٹھ رکعت تراویح ہو جاتی ہیں لیکن بارہ رکعت رہ جاتی ہیں“۔ اس پر وہ صاحب تو خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے البتہ ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالحمید اصغر، جو اس وقت اس مرکز کے امام تھے، بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اس جواب کا بعد میں متعدّد بار ذکر کیا اور کہا کہ عجیب جواب دیا ہے کہ آٹھ ہو جاتی ہیں لیکن بارہ رہ جاتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں سوال کرنے والے کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے جو معاملہ تھا وہ میں نے بتا دیا۔

یمن کے حوثیوں کو تراویح پر کیا اعتراض ہے یہ تو وہی بتائیں گے، مگر ہمارے ہاں بھی بعض دانشوروں نے یہ سوال کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت محمدؐ کے زمانے میں اس طرح تراویح نہیں ہوتی تھیں اس لیے یہ بعد میں مولویوں کی ایجاد لگتی ہے۔ یہ عجیب سی روایت بن گئی ہے کہ دین کی جس بات سے انکار کرنا مقصود ہو اسے مولویوں کی ایجاد کہہ کر پہلے تو اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور پھر آہستہ آہستہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، سنتِ نبویؐ پر ہے، یا تعاملِ صحابہؓ پر ہے۔ بس مولوی کا لفظ اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کے کھاتے میں ڈال کر دین کی کسی بھی بات سے انکار کر دیا جائے۔

ایک نوجوان کا سوال

گزشتہ روز ایک نوجوان نے مجھ سے یہی سوال کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں

تراویح اس طرح ادا نہیں کی گئیں تو بعد میں مولویوں نے یہ کیوں شروع کر دی تھیں؟ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا پہلے یہ معلوم کر لو کہ یہ تراویح شروع کس مولوی نے کی تھیں؟ کہنے لگا کہ یہ مجھے معلوم نہیں ہے، میں نے کہا کہ معلوم تو کر لینا چاہیے۔ اس نے کہا کہ آپ ہی بتا دیں۔ میں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے سب سے پہلے تراویح پڑھائی تھیں، اور ان کے پیچھے پڑھنے والے کم و بیش سبھی صحابہ کرامؓ تھے۔ اس لیے اگر ان مولویوں پر اعتماد ہے تو تم بھی پڑھ لیا کرو لیکن اگر خدانخواستہ ان پر اعتماد نہیں ہے تو پھر صرف تراویح کا معاملہ نہیں، پورے دین سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی کہ سارا دین انہی کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور شاید بعض دانشور حضرات اپنے طرز فکر سے اسی قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

تقویٰ کا مفہوم اور اس کے تقاضے

(۱۳ مئی ۲۰۱۹ء کو گوجرانوالہ میڈیکل کالج میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے گوجرانوالہ میڈیکل کالج آکر خوشی ہوتی ہے، ایک تو اس حوالے سے کہ یہ میرے شہر کا میڈیکل کالج ہے جہاں اساتذہ کے ساتھ ساتھ بچوں اور بچیوں سے اجتماعی ملاقات ہو جاتی ہے، اور کالج کی ترقی اور پیشرفت دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے جو یقیناً پرنسپل محترم ڈاکٹر پروفیسر سمیع ممتاز اور ان کے رفقاء کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرا اس حوالے سے کہ یہاں کا ماحول اور اور سرگرمیاں بھی مسرت کا باعث بنتی ہیں جو فنی، اخلاقی اور دینی تینوں دائروں میں نمایاں دکھائی دیتی ہیں، اور میں اس پر پرنسپل صاحب اور ان کے رفقاء کار بالخصوص ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

نئی نسل میں قراءتِ قرآن اور حمد و نعت کا ذوق

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور کالج کی اسلامک سوسائٹی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر نشست کا اہتمام کر رکھا ہے۔ مختلف بچوں اور بچیوں نے حمد باری تعالیٰ، نعتِ رسول مقبولؐ اور تقریر کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ میں اس سے قبل بھی یہاں آچکا ہوں اور گزشتہ حاضری پر میں نے عرض کیا تھا کہ آج کے اس ماحول میں کالج کے بچوں اور بچیوں سے جب اچھے انداز میں قرآن کریم کی تلاوت سنتا ہوں، حمد و نعت کا ذوق ان میں دیکھتا ہوں، اور ان کے منہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ سنتا ہوں، تو میرا وہ خوف دور ہو جاتا ہے جس سے زمانہ نئی نسل کے بارے میں مسلسل ڈراتا رہتا ہے۔ مگر اس لباس، حلیہ اور ماحول میں قرآن وسنت کا تذکرہ ہوتے دیکھ کر مستقبل کی قیادت کے بارے میں مختلف حلقوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کافور ہونے لگتے ہیں، اور آج بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔

رمضان المبارک کا اصل مقصد

محترم اساتذہ کرام اور طلبہ و طالبات! رمضان المبارک کا برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ ہے۔ قرآن کریم، روزہ، اور صدقہ و خیرات کا مہینہ ہے۔ اور عبادات اور اعمالِ خیر میں سبقت کا مہینہ ہے۔ قرآن

کریم نے اس مہینہ کی سب سے بڑی عبادت روزے کے بارے میں ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے، اسی سلسلہ میں آج کی مختصر گفتگو میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔ روزے کے اور بھی بہت سے فائدے اور برکات ہیں مگر ان میں سے ایک بڑا مقصد تقوٰی پیدا کرنا ہے۔ قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر تقوٰی کا ذکر کیا ہے اور اسے مسلمانوں کا شعار اور اہلِ ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تقوٰی کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

تقوٰی کا لفظی معنٰی ”بچاؤ“ ہے۔ جیسے ہم دنیا کے بہت سے کام کرتے ہیں اور بہت سے کاموں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں اور بہت سی چیزوں کے استعمال سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح دین کے حوالے سے آخرت کی کامیابی اور روح کی ترقی کے لیے بھی جہاں کچھ کام کرنا ضروری ہیں وہاں بہت سارے کاموں اور چیزوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔

تقوٰی کی نبوی مثال

جناب نبی اکرمؐ نے ایک حدیث مبارک میں یہ بات ایک مثال کے ذریعے سمجھائی ہے۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس میں سوال کیا کہ تقوٰی کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ ورسولہ اعلم اللہ تعالٰی اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم کسی لمبے راستے پر جا رہے ہو اور جانے کا وہی ایک راستہ ہو، راستہ تنگ ہو اور دونوں طرف کانٹوں والی جھاڑیاں ہوں، تو اس راستے سے کیسے گزرو گے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ بدن کو سکیڑتے ہوئے اور کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے اس احتیاط کے ساتھ وہاں سے گزریں گے کہ کوئی کانٹا جسم کو نہ چبھے اور کوئی کانٹا کپڑوں سے نہ الجھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقوٰی ہے۔ دنیا ایک گزرگاہ ہے جہاں سے تم نے بہرحال گزرنا ہے، انسانی خواہشات جھاڑیاں ہیں جن کا کوئی حساب و شمار نہیں ہے، جبکہ ان میں کانٹے وہ انسانی گناہ اور اعمالِ سیئہ ہیں جو انسانوں کو ان میں الجھا دیتے ہیں۔ تقوٰی یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اس احتیاط کے ساتھ گزارو کہ گناہ کا کوئی کانٹا تمہیں الجھا نہ دے اور تم ان سے بچتے بچاتے ہوئے زندگی بسر کرو۔

تقوٰی کی یہ خوبصورت مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ روزے تم میں تقوٰی پیدا کرتے ہیں۔ روزے کی حالت میں دن کے وقت کچھ چیزوں کے

استعمال پر پابندی لگ جاتی ہے۔ آج کل ہمارا روزہ کم و بیش پندرہ گھنٹے کا ہے۔ روزہ ہمیں یہ تربیت دیتا ہے کہ جس طرح تم بعض حلال کاموں سے اپنے آپ کو پندرہ گھنٹے کے لیے روک لیتے ہو، اسی طرح ناجائز کاموں سے اپنے آپ کو چوبیس گھنٹے روکنے کا پابند بناؤ۔ اور رمضان کے ایک مہینے میں جس طرح بعض کاموں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہو، اسی طرح سارا سال بچنے کی کوشش کرو۔

شرعی احکام میں حکمتوں کی تلاش

ہمارے ہاں ایک عمومی ماحول پیدا ہو گیا ہے جس میں سوشل میڈیا کا بھی بہت کردار ہے کہ کسی کام سے شرعی طور پر منع کیا جائے تو طرح طرح کے سوالات کھڑے کر دیے جاتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے؟ بلکہ ممنوعہ چیز کے فائدے گننا شروع کر دیتے ہیں۔ روزہ اس کا جواب دیتا ہے کہ خرابی چیز میں نہیں بلکہ حکم تبدیل ہوا ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ دودھ کا جو گلاس سحری سے پہلے جائز تھا، وہ سحری کا وقت ختم ہونے پر ناجائز ہو گیا ہے۔ وہ کھانا جو افطاری کا وقت ہونے سے پہلے منع تھا، وقت ہوتے ہی جائز ہو گیا ہے۔ جبکہ کھائی جانے والی چیز بھی وہی ہے اور کھانے والا بھی وہی ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں بدلا، تو آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کھانے والے شخص یا کھائی جانے والی چیز کا دخل نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی وجہ سے کوئی بات جائز یا ناجائز ہوتی ہے۔ اس لیے کسی شرعی معاملہ کا ذکر کیا جائے تو ایک مسلمان کو ایسی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر بلا تامل قبول کر لینا چاہیے۔

میں میڈیکل کالج کے اساتذہ اور طلبہ سے بات کر رہا ہوں، اس لیے ایک اور مثال بھی آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر جب کسی مریض کو اس کی بیماری کے علاج میں دوائی دیتے ہوئے اس کی خوراک بتاتا ہے، تو اس کے ساتھ کچھ چیزوں کے استعمال سے منع بھی کرتا ہے، جسے پرہیز کہتے ہیں۔ آپ اپنے معالج سے بحث نہیں کرتے کہ چیزیں تو خراب نہیں ہیں پھر آپ ان سے مجھے منع کیوں کر رہے ہیں؟ جس طرح جسمانی صحت کے لیے پرہیز ضروری ہوتا ہے اسی طرح روحانی صحت کے لیے بھی پرہیز ضروری ہوتا ہے اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

میں اس موقع پر طلبہ اور طالبات کے ذہنوں کو دو سوالوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان پر غور کریں:

1. ایک یہ کہ آپ جب اپنی جسمانی صحت کے لیے معالج سے رجوع کرتے ہیں تو استعمال اور

پرہیز کی فہرست خود نہیں بناتے بلکہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں، اور اس بحث میں بھی نہیں پڑتے کہ وہ ان چیزوں سے کیوں منع کر رہا ہے؟

2. اور دوسری بات یہ کہ آپ کا معالج جب آپ کو یہ ہدایات دیتا ہے اور کچھ ایکسر سائز وغیرہ بتاتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دخل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیچھے اس کا علم، فن، تجربہ اور علاج کا ایک پورا نظام ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ علاج کے سلسلہ میں آپ کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور آپ ڈاکٹر کی وہ بات بھی قبول کرتے ہیں جو آپ کی سمجھ میں آرہی ہو، اور وہ بات بھی جو آپ کی سمجھ میں نہ آرہی ہو۔

اسی طرح روحانی صحت اور دینی معاملات میں بھی کوئی عالمِ دین مسئلہ بتائے، کسی کام کے کرنے کا کہے، اور کسی کام سے منع کرے، تو اس میں آپ کو کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی پسند یا ناپسند سے کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ اس کے پیچھے اس کا علم ہے، تجربہ ہے اور ایک پورا نظام ہے جس کی بنیاد پر وہ آپ کی راہنمائی کر رہا ہے۔ اور تقویٰ اسی کا نام ہے کہ دین کا علم رکھنے والوں سے راہنمائی حاصل کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی گزاری جائے، اور روزہ ہمیں اسی کا سبق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مسلمانوں سے قرآن کریم کے چند تقاضے

(روزنامہ اسلام، لاہور--- ۴ مئی ۲۰۲۰ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے جس میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے، سنا جاتا ہے اور عالمِ اسلام میں ہر طرف قرآن کریم کی بہار کا سماں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ یہ آخری کتاب قیامت تک نسلِ انسانی کی ہدایت اور راہنمائی کا محور و مرکز ہے اور ہر دور میں اس کا یہ فیضان جاری رہتا ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم کے چند تقاضوں کی طرف خصوصی توجہ و تذکیر کی ضرورت ہے جو کلام اللہ نے خود ہم سے کیے ہیں، مثلاً:

تلاوتِ قرآن کریم کا یومیہ معمول

ارشاد باری تعالیٰ ہے فاقرءوا ما تیسر من القرآن (المزمل ۲۰) قرآن کریم جتنا پڑھ سکو اس کی تلاوت کیا کرو۔ قرآن کریم کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے الفاظ کی قراءت بھی ضروری ہے اور مستقل عبادت ہے۔ اس کے ہر حرف کے پڑھنے اور سننے پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور یہ قراءت اور سماع مسلمان کے معمولاتِ زندگی میں شامل رہنا ضروری ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ جس مسلمان کے یومیہ معمولات میں تلاوتِ قرآن کریم شامل نہیں ہے اس کا سینہ اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔

درست تلفظ کی پابندی

قرآن کریم کا دوسرا تقاضہ ہے کہ ورتل القرآن ترتیلا (المزمل ۴) قرآن کریم کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ پڑھا جائے۔ ہر زبان کا اپنا لہجہ اور تلفظ ہوتا ہے، اگر کسی لفظ کو صحیح طرح نہ بولا یا پڑھا جائے تو اس کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بیان کے دوران کوئی نوجوان میری گفتگو قلمبند کر رہا تھا، میں نے سوال کیا کہ بیٹا کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگا کہ آپ کی گفتگو کے نوٹس لے رہا ہوں، لیکن تلفظ ایسے کیا کہ Notice۔ میں نے کہا بیٹا ”نوٹس لینا“ تھانے والوں کا کام ہے تمہارا نہیں، تم نوٹس Notes لے لو تو ٹھیک رہے گا۔ اب بولنے میں تلفظ کے بدلنے سے لفظ کا معنیٰ بدل گیا، ایسا ہر زبان میں ہوتا ہے۔ اور

اگر خدانخواستہ قرآن کریم میں ایسا ہو جائے تو بسا اوقات صرف معنیٰ نہیں بدلتا بلکہ ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ صحیح لہجے میں پڑھنا ضروری ہے ورنہ ثواب کی بجائے گناہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ باقاعدہ سیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انگریزی الفاظ اسپیلنگز سیکھے بغیر سمجھ نہیں آتے، قرآن کریم کا تلفظ بھی سیکھے بغیر صحیح نہیں ہوتا، جبکہ قرآن کریم کا تقاضہ ہے کہ مجھے صحیح تلفظ کے ساتھ اور صحیح لہجے میں پڑھو۔

زبانی یاد کرنے کی اہمیت

قرآن کریم کا تیسرا تقاضہ یہ ہے کہ بل ھو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (العنکبوت ۴۹) قرآن کریم کی آیات مبارکہ اہلِ علم کے سینوں میں ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ نے اس آیت کریمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے، کتابت امرِ زائد ہے۔ یعنی قرآن کریم کا اصل حق یہ ہے کہ اسے یاد کیا جائے اور سینہ میں محفوظ کیا جائے۔ قرآن کریم پورا یاد ہو تو بڑی سعادت کی بات ہے، دنیا میں ہر دور میں لاکھوں حفاظ کرام موجود چلے آرہے ہیں، اب شاید کروڑوں میں ہوں کہ اب سے دس سال قبل ایک امریکی ادارے کے سروے کے مطابق دنیا میں قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد تیس ملین کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اگر کوئی مسلمان سارا قرآن کریم یاد نہ کر سکے تو اتنا کم از کم اسے ضرور زبانی یاد ہونا چاہیے کہ پانچ وقت کی نماز کے فرائض و سنن سنت کے مطابق پڑھ سکے اور وقتاً فوقتاً قرآن کریم کے کسی نہ کسی حصے کی زبانی تلاوت کر سکے۔

تفہیم کی ضرورت

قرآن کریم کا چوتھا تقاضہ یہ ہے کہ حتیٰ تعلموا ما تقولون (النساء ۴۳) کہ جو پڑھ رہے ہو وہ تمہیں سمجھ بھی آرہا ہو، یعنی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھو۔ سادہ سی بات ہے کہ جب قرآن کریم ہماری ہدایت کے لیے ہے، راہنمائی کے لیے ہے، اور تعلیم کے لیے ہے تو اسے پڑھتے ہوئے سمجھنا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے اور ہمارے لیے ہے۔ تو پیغام کسی کا بھی ہو، اس کا پہلا حق اسے سمجھنا ہوتا ہے کہ پیغام بھیجنے والے نے ہم سے کیا کہا ہے اور کیا تقاضہ کیا ہے؟ قبول کرنا اور عمل کرنا اس کے بعد کی بات ہے مگر سمجھنا سب سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔ مگر ہماری عمومی حالت کیا ہے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ہم سے مخاطب ہیں اور ہم جانتے ہوئے بھی کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے بات کر رہا

ہے، اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ جبکہ نماز میں ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں، اور ہم خود سمجھ نہیں رہے ہوتے کہ ہم اپنے خالق و مالک سے کیا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم قرآن کریم پڑھتے ہو تو تمہیں سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اس لیے عربی زبان اور قرآن کریم کے ترجمہ کے ساتھ ہر مسلمان کا اتنا تعلق بہرحال ضروری ہے کہ وہ جب قرآن کریم پڑھ رہا ہو تو سمجھ بھی رہا ہو کہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

احکام پر عمل کا تقاضہ

قرآن کریم کا ایک بنیادی تقاضہ ہم سے یہ بھی ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب اس لیے اتاری ہے انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس (النساء ۱۰۵) تاکہ آپ اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں اور حکم کریں۔ یعنی یہ حکم اور فیصلوں کی کتاب ہے، قانون اور ضابطوں کی کتاب ہے، جس کے مطابق مسلمانوں کو اپنی زندگی کے تمام معاملات طے کرنے چاہئیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات اور احکام نازل فرمائے ہیں، جن پر عمل ہماری مرضی پر موقوف نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے۔ مثلاً حلال و حرام کے مسائل ہیں، باہمی حقوق و معاملات کے امور ہیں، فرائض و عبادات ہیں، تجارت کے احکام و قوانین ہیں، سیاست و حکومت کے قوانین ہیں، عدالت و قانون کے بارے میں ہدایات ہیں، معاشرت اور سماجیات سے متعلق راہنمائی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کے ضابطے ہیں، اور خاندانی زندگی میں نکاح، طلاق، وراثت اور باہمی حقوق کی تفصیلات ہیں۔ ان احکامات کی اپنے اپنے دائرے میں پابندی اور ان پر عملدرآمد ہماری دینی ذمہ داری ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن جوابدہی کرنا ہوگی۔

یہ چند تقاضے وہ ہیں جو قرآن کریم نے ہم سے خود کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

فرقانِ حمید اور فاروقِ اعظمؓ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ اگست ۲۰۲۱ء)

قرآنِ کریم نے اپنا دوسرا نام ''الفرقان'' بتایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ''الفاروق'' کے لقب سے معروف ہیں۔ دونوں کا معنٰی حق و باطل میں فرق کرنے والا بنتا ہے۔ جبکہ اس لفظی مناسبت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زندگی بھر کا طرز عمل بھی اس مشابہت و مماثلت کی گواہی دیتا ہے جس کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں:

حضرت عمرؓ کی زندگی کے چند اہم مراحل

حضرت عمرؓ بن الخطاب گھر سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ قتل کرنے کے ارادے سے تلوار لے کر چلے تھے مگر راستہ میں بہن کے گھر قرآن کریم سننے کا موقع مل گیا اور اس سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے دور میں مختلف جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادت کی خبریں آنے لگیں تو حضرت عمرؓ کی تجویز بلکہ تحریک پر قرآن کریم کو کتابی شکل میں مرتب کر کے محفوظ کر لیا گیا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت تک لوگ رمضان المبارک میں عشاء کے بعد مختلف ٹولیوں کی صورت میں اور اکیلے اکیلے نوافل میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے سب کو ایک امام کے پیچھے اکٹھے کر کے تراویح پڑھنے کا حکم دیا، اور اس طرح مساجد میں باجماعت تراویح اور مکمل قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا بابرکت عمل شروع ہوا جو اَب تک جاری ہے۔

حضرت عمرؓ کی مختلف آرا کی تائید میں قرآن کریم کی متعدّد آیات نازل ہوئیں جنہیں ''موافقاتِ عمرؓ'' کہا جاتا ہے اور جن کی تعداد امام سیوطیؒ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں بائیس تک شمار کی ہے۔

حضرت عمرؓ نے مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے باقاعدہ مکاتب قائم کرنے کا حکم دیا اور مختلف علاقوں میں ان کا آغاز ہوا۔

حضرت عمرؓ نے صوبائی گورنروں کو قرآن کریم کے حفاظ شمار کرنے کا حکم دیا اور بیت المال سے ان کے وظیفے مقرر فرمائے جو ''طبقات ابن سعدؒ'' کی ایک روایت کے مطابق اڑھائی ہزار درہم سالانہ تک تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام مکتوب

قرآن کریم کی تعلیم کے بارے میں امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اپنے گورنروں کو باقاعدہ احکامات جاری کیے اور تفصیلی خطوط لکھے۔ جن میں سے بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام ان کا مکتوب گرامی ''کنزالعمال'' جلد اول میں اس طرح مذکور ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اللہ کے بندے عمر بن الخطابؓ کی طرف سے

عبداللہ بن قیسؓ (ابو موسیٰ اشعری) اور حفاظ قرآن کے نام۔

السلام علیکم۔

- واضح ہو کہ یہ قرآن کریم تمہارے لیے باعثِ اجر و ثواب ہونے والا ہے، لہٰذا اس کی تعلیم پر عمل کرو اور اسے اپنے مقاصد کا آلۂ کار نہ بناؤ۔
- جو قرآن کریم کو اپنا قائد و متبوع بنائے گا، قرآن کریم اسے جنت کی سیر کرائے گا۔
- قرآن کریم کو خدا کے حضور تمہارا سفارشی ہونا چاہیئے، نہ کہ تمہارے خلاف شکایت کرنے والا، کیونکہ قرآن جس کا سفارشی ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے خلاف شکایت کرے گا وہ دوزخ میں جلے گا۔
- جب خدا کا بندہ رات میں اٹھتا ہے اور مسواک کر کے وضو کرتا ہے، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھتا ہے، تو فرشتہ اس کا منہ چومتا ہے اور کہتا ہے کہ پڑھو پڑھو، تم پاک و صاف ہوگئے، قرآن کریم پڑھ کر تمہیں لطف آئے گا۔
- قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ، علم کا پھول اور رحمٰن کا تازہ کلام ہے۔
- اگر رات میں اٹھنے والا بغیر مسواک کے وضو کرتا ہے تو فرشتہ اس کی نگرانی تو کرتا ہے لیکن منہ نہیں چومتا۔
- نماز میں قرآن پڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھپا ہوا خزانہ مل جائے اور مخفی دولت حاصل ہو

جائے۔

- قرآن کریم پڑھا کرو، نماز نور ہے، زکوٰۃ برہان ہے، صبر روشنی ہے، روزہ ڈھال ہے، اور قرآن تمہارے بارے میں ایک دلیل ہے۔
- قرآن کریم کا احترام کرو اور اس سے بے اعتنائی نہ برتو، کیونکہ خدا اس کی عزت کرتا ہے جو قرآن کریم کی عزت کرتا ہے، اور اس کو بے آبرو کر دیتا ہے جو قرآن کریم کی بے حرمتی کرتا ہے۔
- جو شخص قرآن کریم پڑھے، اس کو یاد کرے، اور پھر اس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے، دعا کرنے والا چاہے تو خدا دنیا میں اس کی دعا کو پورا کر دیتا ہے ورنہ اس کی مانگی ہوئی چیز آخرت کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔
- یاد رکھو خدا کا انعام بہترین اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کو نصیب ہو گا جو صاحبِ ایمان ہیں اور اپنے مالک پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

فرقانِ حمید اور فاروقِ اعظمؓ کا یہ تعلق جہاں امیر المومنین حضرت عمرؓ کی فضیلت وعظمت کی شہادت ہے، وہاں قیامت تک کے مسلمان حکمرانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے کہ کسی مسلم ریاست کے حکمرانوں کا قرآن کریم کی تعلیمات کے فروغ کے حوالے سے کیا کردار بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

رمضان المبارک کی برکات
اور ہماری ملّی صورتحال

(ماہنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۲۰۲۲ء)

ماہِ مبارک کی برکتیں اور رحمتیں

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس مقدس مہینہ کی برکتوں اور رحمتوں سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی تیاریاں کررہے ہیں:

- یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس میں قرآن کریم کی تلاوت اور سماع کی عجیب بہار ہوتی ہے اور پوری دنیا میں چوبیس گھنٹے اس کی آواز گونجتی رہتی ہے۔
- یہ روزوں کا مبارک مہینہ ہے جس میں مسلمان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھانا پینا ترک کر کے برکتوں کے حصول اور نفس کے تزکیہ کا سامان کرتے ہیں۔
- اور یہ سخاوت اور صدقہ و خیرات کا مہینہ ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارا سال سخی ہوتے تھے اور آپ کے دروازے سے کوئی ضرورتمند خالی نہیں جاتا تھا، مگر رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت کا ماحول ایسا ہوجاتا تھا جیسے شدید گرم موسم میں ٹھنڈی ہوا کی لہر چھا گئی ہو۔
- اس ماہِ مبارک اور اس کی فضیلت و برکت کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و محبت آج بھی قابلِ رشک ہے اور کرۂ ارضی پر بسنے والے انسانوں میں کسی اور مذہب کے پیروکار اس معاملہ میں مسلمانوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔
- اس مبارک مہینے میں مسلمان روحانی طور پر ”ری چارج“ ہو کر اگلے سال کے معمولات کے لیے تازہ دم ہوجاتے ہیں اور زندگی کا یہ نظام اسی تسلسل کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔
- ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ الصوم لی وانا اجزی به روزہ میرے لیے

ہے اور میں اس کا اجر اپنی مرضی سے دوں گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ روزہ واحد عبادت ہے جس کا زبان سے اظہار نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اس کا علم نہیں ہوتا، اس لیے اس میں ریاکاری کا احتمال سب سے کم ہے، اس وجہ سے اس کا اجر و ثواب نہ صرف یہ کہ زیادہ ہے بلکہ اس ماہِ مبارک میں دوسری عبادات اور اعمالِ خیر کا اجر بھی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

- یہ تقویٰ اور تزکیہ نفس کا مہینہ ہے جس میں مسلمان کو اپنے گناہوں کے دھونے اور نفس کی صفائی و طہارت کا موقع ملتا ہے اور اصحابِ ذوق اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔
- اور یہ صبر و استقامت کے ساتھ شکرگزاری کا مہینہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ نعمتوں پر مسلمانوں کو اپنے رب کی کسی نہ کسی طرح شکرگزاری کا ماحول مل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور ہماری ملّی صورتحال

یہ سب رمضان المبارک کی برکات ہیں اور اس کا فیض ہے مگر اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے یوں فرمایا ہے لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید (ابراہیم ۷) اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بہت سخت ہوگا۔ جس کی سنگین ترین صورت قرآن کریم میں ہی ان الفاظ میں مذکور ہے کہ لا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم (الحشر ۱۹) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔

آج ہم مسلمان پوری دنیا میں جس صورتحال سے دوچار ہیں، اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ خدانخواستہ ہم اس کیفیت سے دوچار ہو گئے ہیں، اپنے نفع نقصان سے بے خبر ہو جانا اور سود و زیاں سے غافل ہو جانا خدائی عذاب کی سب سے سنگین صورت ہے۔ اور آج ملتِ اسلامیہ اسی ماحول میں غیروں کی دریوزہ گر ہو کر باہم دست و گریبان ہے۔ اس لیے آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ذاتی گناہوں سے توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ ملّی اور اجتماعی طور پر بھی توبہ و استغفار کا اہتمام کریں، اور رمضان المبارک کو دین کی طرف امت کی اجتماعی واپسی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔